فصلِ گل آئی یا اجل آئی

قرۃ العین حیدر

فصلِ گل آئی یا اجل آئی

S1128

فصلِ گل آئی یا اجل آئی

قرۃ العین حیدر

مکتبۂ اُردو ادب لاہور
۱۴۹۵-بی بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ

جملہ حقوق محفوظ

ناشر ـــــــــــــــ سرفراز احمد
اہتمام ـــــــــــــــ شکیل احمد
اشاعت ـــــــــــــــ جون ۱۹۷۸ء
مطبع ـــــــــــــــ ریاض برادرز پرنٹرز
قیمت ـــــــــــــــ 16 روپے

فہرس

ایک تصویر	۹
بڑے آدمی	۲۳
فوٹوگرافر	۳۷
سنگھار دان	۴۷
دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار	۷۹
تار پر چلنے والی	۱۱۷
فصل گل آئی یا اجل آئی	۱۳۳
آوارہ گرد	۱۵۶

فصلِ گُل آئی یا اجل آئی کیوں درِ زنداں کُھلتا ہے

کیا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھُوٹ گیا

فانیؔ

ایک تصویر

اودھ کے ضلع سیتاپور میں میرے پھوپھا کورٹ آف وارڈز کے منیجر تھے۔ وہاں پھوپھی کے زنانہ ڈرائنگ روم کی ایک دیوار پر سنہرے منقش فریم میں ایک نوعمر رانی صاحبہ کی قدآدم رنگین تصویر لگی ہوئی تھی۔ تصویر نے سچ مچ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ تصویر کو اصلی کپڑوں اور زیور سے آراستہ کرنا اس زمانے کا شاید ایک خاص فن تھا، کیونکہ اس طرح کی ایک بنگالی خاتون کی تصویر میں نے کلکتہ میں بھی دیکھی تھی، بہر حال —— بھری دوپہر کو یا شام کے وقت اس نیم تاریک کمرے میں جانے پر اچانک ایسا لگتا تھا جیسے کوئی جیتی جاگتی لڑکی سامنے کھڑی ہے۔ ڈر سا لگتا تھا۔ اندھیرا پڑے جب مٹی کے تیل کے بڑے بڑے لیمپ جلائے جاتے تو ان کی روشنیوں میں جھلملاتی یہ تصویر اور زیادہ عجیب، ڈرامائی اور سہانی سی معلوم ہوتی۔

سیتاپور کی شامیں بھی بے حد سہانی ہوتی تھیں۔ وسیع اور پُر فضا باغ پر وہ پُر فسوں خاموشی طاری ہوتی جو یوپی اور خصوصاً مشرقی یوپی کے موسم گرما کی خصوصیت

ہے، جب پھولوں اور آم کے درختوں کی مہک اور گھاس کی خنکی اور فضا کی حدّت سب مِل جُل کر ایک ہو جاتے ہیں۔

ایسی ہی ایک شام کو ہم سارے بچے لان میں کھیل رہے تھے جب ایک "سیلون کار" برساتی میں آکر رُکی جس کی کھڑکیوں میں چینی ریشم کے نیلے پردے لگے ہوئے تھے۔ فوراً پردہ گرایا گیا اور وہ تصویر والی گوری چٹی رانی صاحبہ سہج سہج چلتی گھاس پر آ گئیں۔ تصویر میں ان کی مانگ میں سیندور لگا ہوا تھا، بالوں کے گچھے سے بنے تھے، اور جھالر دار بلاؤز کے ساتھ رعنائی رنگ کی بنارسی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جس پر جڑاؤ بروچ چمک رہا تھا (بلاؤز، ساری اور بروچ سب اصلی تھے اور بڑی چابک دستی سے تصویر پر چپکائے گئے تھے) لیکن اس وقت ان کی مانگ سونی تھی اور وہ سفید ریشمیں ساری پہنے ہوئے تھیں۔ ایک اینگلو انڈین گورنس ان کے اکلوتے تین سالہ لڑکے کی انگلی تھامے ان کے پیچھے پیچھے کار سے برآمد ہوئی۔ رانی صاحبہ پھوپھی اور پھوپھا کے ساتھ باتوں میں مشغول ہو گئیں اور ہم بچوں کو وہاں سے ہانک دیا گیا۔

یہ دمینتی دیوی آف رام کوٹ راج تھیں، جن کو اس روز میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ میری عمر جب کوئی چھ برس تھی۔ ان کی وہ کپڑوں والی تصویر اور ان کا لان پر آنا آج تک مجھے اسی طرح یاد ہے۔ اس وقت راجہ صاحب کے انتقال کو سال بھر ہوا تھا۔ اور علاقہ کورٹ میں تھا۔ پھوپھی سے ان کی بہت دوستی تھی اور پھوپھا ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ بے چاری زمیں داری کے جھگڑوں میں گھری ہوئی تھیں اور رشتے دار ان کی مدد کرنے کی بجائے

ان سے مقدمے لڑ رہے تھے۔ عدالتی معاملات کی دیکھ بھال کی غرض سے وہ اینگلو انڈین گورنس سے انگریزی بھی سیکھ رہی تھیں۔ ومیلنتی دیوی خود ایک پابند وضع تعلقے دار کی بیٹی تھیں اور پردے میں رہتی تھیں۔

تقریباً سات برس بعد کا ذکر ہے۔

میرے ہائی سکول کے امتحان ہونے والے تھے اور میں اکثر برڈ وس کی خالی کوٹھی کے کسی ڈھنڈار کمرے میں بیٹھ کر کلاسیکل موسیقی کے پرچے کے لئے زور زور سے سبق یاد کیا کرتی تھی۔ جب آآآ کرتے کرتے میرا ناک میں دم آجاتا تو کوئی ہلکا پھلکا گیت الاپنا شروع کر دیتی۔ اس روز میں بھوپالی کے تان پلٹے یاد کرنے کے بجائے نہایت خشوع و خضوع سے جو تھیڈ کا رائے کے "ٹھاکر روٹھ گئے ہیں کیسے انہیں مناؤں" کا وظیفہ کر رہی تھی کہ اچانک ایسا محسوس ہوا کہ پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ تراشیدہ بالوں والی ایک بے حد اسمارٹ خاتون بغیر آستین کے بلاؤز اور سفید جارجٹ کی ساری میں ملبوس، دروازے سے لگی میری "نغمہ صحرائی" سُن رہی ہیں اور ان کے ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسم ہے۔ میں تو ان کو پہچانی نہیں، مگر انہوں نے برابر کے پھاٹک پر والد کے نام کا بورڈ دیکھ لیا تھا۔ میں جھینپ کر اٹھ کر کھڑی ہوئی تو انہوں نے کہا، "بیٹا ہمیں پہچانیں نہیں —— ہم تمہاری بوا کی سہیلی ہیں۔"

"رانی صاحب ——!" میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں بیٹا —— اب ہم تمہارے پڑوسی ہیں ——" انہوں نے جواب دیا۔

اسی وقت فرنیچر کا ٹرک باہر آکر رکا اور غل غپاڑہ شروع ہوگیا۔

"چلو ہم تمہارے یہاں سب سے مل آئیں ——" رانی صاحبہ نے کہا۔ ملازموں کو چند احکام دینے کے بعد وہ باہر آئیں اور میرے ساتھ ساتھ باڑ پھلانگ کر ہمارے احاطے میں داخل ہوگئیں۔

ہمارے یہاں اس وقت پچھلے برآمدے میں سہ پہر کی چائے پی جا رہی تھی۔ ابھی رانی صاحبہ کو بیٹھے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے۔ کہ ایک بے حد خوبصورت نوجوان سیڑھیوں پہ نمودار ہوا۔ اس نے ادب سے سب کو تسلیم کی اور رانی صاحب سے کہا "مصرا صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"ابھی آتے ہیں —— اور دیکھو سیکریٹری —— مدار بخش سے کہو وہ بھی ٹھہرے ——"

"یس رانی صاحب ——" لڑکے نے جواب دیا اور الٹے پاؤں واپس ہوگیا۔

دمینتی دیوی پھر باتوں میں مصروف ہوگئیں، مگر انہوں نے جس تحکم اور سنجیدگی سے اس لڑکے کو "سیکریٹری" کہا وہ مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوا۔ کیونکہ دبلا پتلا حسین لڑکا جو شکل سے کشمیری معلوم ہوتا تھا۔ سیکریٹری کسی طرح نہ لگتا تھا۔

رانی صاحبہ نے جلد ہی جلدی چائے ختم کی اور واپس چلی گئیں۔

اس وقت رانی صاحبہ کوئی پینتیس برس کی رہی ہوں گی۔ وہ سیکریٹری سے انگریزی بول رہی تھیں۔ علاقے کا کام خود سنبھالتی تھیں۔ فراٹے سے کار چلاتی تھیں اور مسوری کا "سیزن" بال روم رقص اور برج میں گزارتی تھیں وہ باوقار

پردہ نشین بی بی جن کو میں نے سیتاپور میں دیکھا تھا۔ وہ بنارسی ساری میں لپٹی ہوئی تصویر جو پھوپھا کے لکھنؤ والے گھر کے ڈرائنگ روم میں اب بھی موجود تھی۔ ان میں اور اس ماڈرن خاتون میں بڑا فرق تھا۔ سات سال میں کایا پلٹ گئی تھی۔ دمینتی دیوی "سوسائٹی ٹائپ" بن چکی تھیں۔

والد صاحب آزادیٔ نسواں کے جوشیلے علمبردار تھے، مگر ان کو یہ بے حد جدید ٹائپ بہت ناپسند تھا۔ اس وجہ سے ہماری ملاقات اب رانی صاحب سے بہت کم ہوتی تھی۔ اکثر ان کے یہاں سے رات گئے تک پارٹیوں کے شور و شغب کی آواز آتی رہتی تھی۔ جب رانی صاحبہ علاقے پر چلی جاتیں تو ان کا سیکرٹری ان کی غیر موجودگی میں ایک فلمی ریکارڈ بار بار بجاتا۔

آرام کہاں دل جو پڑا غیر کے پالے
مفلس کو خدا عشق کے پھندے میں نہ ڈالے

اکثر گراموفون کی سوئی ایک جگہ پہ اٹک کر "مفلس کو خدا مفلس کو خدا مفلس کو خدا" کی تکرار کرتی، جو کانوں کو سخت ناگوار گزرتا۔

مگر ایک خاصے ڈرامائی واقعہ نے اس غل غپاڑے کا خاتمہ بالخیر کر دیا۔

ایک روز صبح سویرے والد صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ رانی صاحبہ نے سراسیمگی کے عالم میں دریچے میں سے اندر جھانکا اور بولیں "بڑا غضب ہو گیا —— میرے ساتھ چلئے —— فوراً —— بڑا غضب ہو گیا۔"

والد گھبرا کر فوراً برآمدے میں گئے۔

"سیکرٹری نے خودکشی کرلی ـــــ فوراً میرے ساتھ چلئے ـــــ او مائی گاڈ ـــــ اب تک مر بھی چکا ہوگا ـــــ اوہ ـــــ اوہ ـــــ کہہ رہا تھا ریل کی پٹڑی پر جا لیٹوں گا ـــــ اوہ ـــــ"

"ٹھہرئیے میں کپڑے تبدیل کرلوں ـــــ" والد بے چاروں نے پریشانی سے کہا۔

"نہیں ـــــ نہیں ـــــ ایسے ہی چلیئے ـــــ جلدی۔" رانی صاحبہ نے بدحواسی سے جواب دیا۔ والد قمیص پاجامہ پہنے ہی ان کی کار میں بیٹھ گئے اور کار زن سے پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ انہوں نے جاکر بارہ بنکی جانے والے قریبی ریلوے لائن کا ناکام جائزہ لیا ـــــ جہاں رانی صاحبہ کے بیان کے مطابق سیکریٹری نے جان تبریں جان آفریں کے سپرد کردی تھی۔ آخر پولیس چوکی پر اس گم شدگی کی اطلاع کرانے کے بعد جب وہ واپس لوٹیں تو مصراجی (ان کے منشی) نے پان چباتے ہوئے اطمینان سے خبر سنائی کہ سیکریٹری حضرت گنج کے کافی ہاؤس میں قہوہ پیتا اور نمکین مونگ پھلی کھاتا پایا گیا ہے اور یہ بھی کہ کافی میں زہر نہیں ملا تھا۔ اس کے بعد وہ ہونہار نوجوان بالکل غائب ہوگیا۔

سیکریٹری کے جانے کے بعد دمینتی دیوی بہت دنوں تک اپنے لان پر نظر نہیں آئیں۔ ڈنر اور پارٹیاں موقوف ہوئیں۔ ان کے گھر پہ سناٹا سا چھا گیا۔

گرمیاں نکلیں ـــــ جاڑے آگئے ـــــ ایک روز میں پچھلے باغ میں ایک درخت کی شاخ پر بیٹھی بہت عرصہ بعد "ٹھاکر روٹھ گئے ہیں" الاپ رہی تھی۔ کہ رانی صاحبہ مہندی کی باڑ کے نزدیک آکر کھڑی ہوگئیں ـــــ کچھ دیر یوں ہی چپ

کھڑی رہیں، اور پھر اپنے مکان کی طرف واپس چلی گئیں۔

اس دوران میں ان کی ذاتی کوٹھی بٹلر گنج میں تعمیر ہو چکی تھی۔ چند روز بعد وہ وہاں منتقل ہو گئیں اور مدتوں کہیں دکھائی نہ دیں۔

مزید چند سال گزر گئے۔

نفیسہ نامی ایک لڑکی بی اے میں میری ہم جماعت تھی۔

اس کی جن بزرگوار سے منگنی ہوئی وہ بھی بڑے سخت "سوسائٹی ٹائپ" تھے۔ منگنی کے بعد انہوں نے نفیسہ اور اس کی سہیلیوں کو ایک ڈنر پر مدعو کیا جو پروفیسر کھوچڑ کے گھر پر دیا گیا تھا۔ پروفیسر کھوچڑ یونیورسٹی کے ایک نامور سائنسدان تھے۔ ان کی لڑکیاں بہت خوبصورت تھیں اور ان کی برج پارٹیوں میں لکھنؤ کے سارے فیشن ایبل رؤسا اور امرا آیا کرتے تھے۔ نفیسہ کا منگیتر حامد زبردست اسنوب (SNOB) تھا، اور بات اس طرح شروع کرتا تھا "کل میں اور غوث محمد لیڈی مہاراج سنگھ کے ہاں چائے پی رہے تھے تو وہاں لیڈی سریواستوا مجھ سے کہنے لگیں۔"

یار اس مرتبہ مسوری میں ہز ہائی نس آف راج پیپلا نے بتایا کہ ...."

لہٰذا جب ہم لوگ پروفیسر کھوچڑ کے وہاں پہنچے تو حامد اس محفل میں اس طرح جا شامل ہوا جس طرح بطخ پانی پر تیرنے لگتی ہے۔ مختلف راجاؤں، نوابوں اور آئی سی ایس افسروں کے کندھوں پر بے تکلف تھپکیاں لگانے اور ان کی خواتین کی طرف مسکراہٹیں پھینکنے کے بعد وہ اس گوشے میں پہنچا جہاں ایک طویل القامت، خوب رو شخص کاک ٹیل کا گلاس ہاتھ میں تھامے، آتش دان پر کہنی لگائے پوز بناتے کھڑا بالتی کھوچڑ سے باتیں کر رہا تھا۔

"ارے یار منظور ——" حامد نے قریب پہنچ کر کہا، "یار تم پرسوں سر جے پی کے لنچ پر نہیں آئے؟ خانم حاجی بھی مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اپنا منظور آج کل کہاں غائب ہے۔"

منظور صاحب نے ایک ابرو اٹھا کر اپنی بلندی سے حامد کو دیکھا اور مسکرائے "ہلو —— یو سو اینڈ سو (HELLO YOU SO AND SO) انہوں نے گمبھیر آواز میں کہا۔

"ہاہاہا —— حامد نے منظور صاحب کے کندھے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا اور دو چار باتیں کر کے ہماری طرف لوٹا۔

"یہ منظور صاحب کون ہیں؟ نفیسہ نے پوچھا۔

"ارے وہی ——"

"وہی کون ——؟"

"ارے بھئی اپنی و مینتی کے سیکرٹری ——"

"و مینتی کون ——؟" نفیسہ نے پوچھا۔

"رانی صاحبہ رام کوٹ راج —— مگر اب کچھ معزور سا ہو گیا ہے۔ کم بخت۔ کونسل کی ممبر تو ہوئی ہیں رانی صاحبہ اور دماغ اس کے آسمان پر چڑھ گئے۔" حامد نے جواب دیا۔

"اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ مگر جب مفت کا عیش ملے تو ہماری تمہاری طرح محنت مزدوری کی اسے کیا ضرورت ہے۔" ہم لوگوں کے قریب بیٹھے ہوئے ایک مہمان نے کہا۔

"ارے بھئی! ہمیں کوئی اپنا سیکریٹری نہیں بناتا ——— "دوسرے مہمان نے جو زیادہ پی گئے تھے، آنسو بہلاتے ہوئے کہا۔

یہ مکالمہ میری سمجھ میں نہیں آیا، لیکن چند لمحوں بعد ہی کھانا شروع ہوگیا اور منظور احمد صاحب جب خالی پلیٹیں بانٹتے ہوئے میرے پاس آئے تو میں نے ان سے "مینٹی دیوی کی خیریت دریافت کی۔ منظور صاحب نے بڑے اخلاق سے بتایا کہ رانی صاحبہ کا لڑکا رندھیر جواہر نگر کالونی متعلق دار کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ایئر فورس کی ٹریننگ کے لئے کل انبالے جا رہا ہے۔ رانی صاحبہ اس کی روانگی کی تیاریوں میں مصروف ہیں، اس لئے یہاں دعوت میں نہ آسکیں ——— اس کے بعد منظور صاحب مجمع میں کھو گئے۔

کچھ برس اور گزر گئے۔

کوئی دو تین برس ادھر کی بات ہے۔ میں اپنے میزبانوں شوبھا اور ترلوک ماتھر اور شوبھا کی چھوٹی بہن نمی کے ساتھ دلی کے ایک پیٹرنز ہوٹل کے ایک تقریباً سنسان ڈرائنگ روم میں آتش دان کے قریب بیٹھی تھی۔ باہر کڑاکے کا جاڑہ پڑ رہا تھا۔ آتش دان میں تیز آگ لہک رہی تھی اور ہم لوگ کافی ختم کر کے گھر جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ ایک عمر رسیدہ امریکن جوڑا قریب سے گزرا۔ اس کے بعد سترہ برس سے اوپر کی عمر والے امریکن سیاحوں کی ایک پوری ٹولی ڈرائنگ روم میں سے گزر کر برابر کے کمرے میں چلی گئی۔

"آج کل اینٹی بائیوٹکس (ANTI-BIOTICS) نے عمریں بڑھا دی ہیں۔ وافر عمر، وافر دولت و عشرت۔ کیا زندگیاں ہیں! ان لوگوں کی!" ترلوک نے کہا۔

اینٹی بائیوٹکس کے لفظ پر بائیو کیمسٹری میرے ذہن میں آئی۔ جس کا نام بھی میرے لئے ناقابلِ فہم ہے۔ شوبھا کی بہن نلنی بائیو کیمسٹری میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہی تھی۔

"تم کس مضمون پر ریسرچ کر رہی ہو۔" میں نے جماہی لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"چوہے کے جگر پر۔"

"غضب خدا کا۔"

"لو ایسا ہو لئے بلبل کہ ہو بہتر ہے ترنم سے کبوتر کے تنِ نازک میں چوہے کا جگر پیدا۔"

ترلوک نے لہک کر کہا۔

"لیکن مہمل بات ہے۔" میں نے اکتا کر کہا — مجھے زور کی نیند آ رہی تھی۔

"وافر عمر، وافر دولت، وافر عیش" ترلوک نے دہرایا۔

"غلط — بالکل غلط — ڈرائنگ روم کے ایک کونے سے ایک بھاری آواز بلند ہوئی۔ ہم لوگوں نے چونک کر اس طرف دیکھا وسیع کمرے کے دوسرے سرے پہ ایک اسٹینڈرڈ لیمپ کے سائے میں ایک ہندوستانی اور ایک یورپین جوڑا برج میں مصروف تھا۔ ہندوستانی خاتون کی پشت ہماری طرف تھی اور ان کے سفید بال جو جدید فیشن کے مطابق نیلے رنگے ہوئے تھے۔ مدھم روشنی میں چمک رہے تھے۔ بھاری آواز والے ہندوستانی مرد نے پائپ کی راکھ جھٹکتے ہوئے ہماری طرف سرسری نگاہ ڈالی۔ مجھے ان کا جھرّیوں والا چہرہ ذرا مانوس سا معلوم ہوا پھر وہ کوشش سے چھڑی کے سہارے اٹھے، ذرا لنگڑاتے ہوئے گیلری کے

دروازے پر جاکر انہوں نے بیرے کو آواز دی اور واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے (وہ کھیل میں "ڈمی" تھے) چند لمحوں کے بعد انہوں نے پہلو بدل کر اپنی ریسٹ واچ پہ نظر ڈالی۔

"کیا بات ہے؟" بوڑھی عورت نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، انسان فانی ہے۔ اس لئے بار بار گھڑی دیکھتا ہے۔" انہوں نے اسی گمبھیر آواز میں جواب دیا۔

کمرے میں عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ نیلے بالوں والی ضعیفہ خاموشی سے کھیل میں منہمک رہیں۔ بیرا اندر آیا۔ اس نے مشروبات کی کشتی قریب کی تپائی پر رکھی۔ اور واپس چلا گیا۔

اتنے میں ایک خوش شکل نوجوان، سرخ "ٹرٹل نیک" سویٹر اور سیاہ پتلون میں ملبوس، کوٹ کندھوں پہ ڈالے، ہوا کے جھونکے کی طرح اندر آیا۔ ذرا ادا سے چلتا۔ ہم لوگوں کو نگاہِ غلط انداز سے دیکھتا ہوا وہ برج ٹیبل کے پاس گیا اور پیانو سے ٹک کر کھیل دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ نیلے بالوں والی خاتون نے سر اٹھا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک ادلتے دل بری کے ساتھ نوجوان نے نفی میں سر ہلایا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر دیوار پہ لگی ہوئی تصویریں دیکھنے لگا۔

ہم لوگ گھر جانے کے لئے اٹھے اور دروازے کی سمت جانے کے لئے برج ٹیبل کے پاس سے گذرنے لگے۔ تو نیلے بالوں والی خاتون نے سر اٹھایا اور تیوری پہ بل ڈال کر مجھے غور سے دیکھا۔

"ارے ——— یہ تو رانی صاحبہ رام کوٹ ہیں۔" شوبھا نے آہستہ سے کہا۔ "بے چاری کا اکلوتا لڑکا پچھلے سال ہوائی جہاز کے حادثہ میں مارا گیا۔ بہترین پائلٹ تھا۔"

میں ان کے قریب گئی۔ چند لمحے مجھے دیکھتے رہنے کے بعد وہ پہچان گئیں اور کرسی سے اُٹھ کر مجھ سے لپٹ گئیں۔ پھر انہوں نے میرے خاندان والوں کی خیریت دریافت کی۔ میں قریب کے صوفے کے ہتھے پر ٹک گئی۔ رانی صاحبہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "تمہاری لوا سے کبھی کبھار لکھنؤ میں ملاقات ہو جاتی ہے جب سے تمہارے پھوپھا کا انتقال ہوا ہے وہ کہیں آتیں جاتیں نہیں ——"

"کس کا انتقال ہوا ہے؟" بھاری آواز والے مرد نے تاش سمیٹتے ہوئے بے دھیانی سے سوال کیا۔

"خان بہادر صاحب بے چارے کا ———" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "میرے ساتھ تو تم جانتی ہو بیٹیا انہوں نے ساری عمر سگے بھائیوں سے بڑھ کر سلوک کیا۔"

اب میں بھی پہچان گئی۔ بھاری آواز والے صاحب منظور احمد تھے۔ مگر اب وہ بے حد دبلے پتلے مریض، بدمزاج اور چڑچڑے سے نظر آتے تھے۔ رانی صاحبہ بات کرتے کرتے ان کی طرف اس طرح دیکھ لیتی تھیں۔ جیسے بیوی اپنے شوہر کی بدمزاجی برداشت کرنے کی عادی ہو جاتی ہے۔

میں نے ترلوک، شوبھا اور نلنی کا رانی صاحبہ سے تعارف کرایا۔ رانی صاحبہ نے ڈچ جوڑے کو ہم لوگوں سے ملوایا۔

"تمہاری بوا بے چاری بھی بوڑھی ہو گئیں ——— اتنی سندر تھیں جوانی میں ——"
وہ اسی اداس آواز میں کہتی رہیں۔

"ہم سب بوڑھے ہو گئے ہیں ———" منظور صاحب نے جھنجلا کر ان سے کہا اور زور سے پائپ جھٹکنے لگے۔

سرخ سویٹر والا شکیل نوجوان اٹھلاتا ہوا آکر دوبارہ کھیل دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اسے دیکھ کر دبنیتی دبوی کے تھکے ہوئے چہرے پر اجالا سا پھیل گیا۔ آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اب نیلے بالوں کے ساتھ ان میں ایک خاص وقار سا آ گیا تھا۔

ڈچ میاں بیوی خاموش بیٹھے تھے۔ اب ڈچ خاتون نے لڑکے کو نظر بھر کے دیکھا اور ذرا ہلکی سی سوالیہ نگاہ منظور صاحب پر ڈالی۔

"ہماری پلیسمنٹ (REPLACEMENT)" منظور صاحب نے کرسی سے اٹھتے ہوئے ڈچ جوڑے سے کہا ——— "گوکل چیڈہ رانی صاحبہ کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکریٹری ——— مسٹر اینڈ مسز خان ٹوک ——"

نوجوان نے مسکرا کر سر خم کیا اور منظور صاحب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ منظور صاحب لنگڑاتے ہوئے ایک طرف کو چلے گئے۔ رانی صاحبہ پھر تاش میں محو ہو گئیں۔

"وَن نو ٹرمپ۔"

"ٹو ہارٹس۔"

"ٹو نو ٹرمپس۔"

"تھری ہارٹس۔"

میں نے رانی صاحبہ کو خدا حافظ کہا اور دروازے پر پہنچ کر ایک بار پھر کمرے

پر نظر ڈالی۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ اور ایک میز کے گرد چار سر جھکے ہوتے تھے۔ دمینتی دیوی کے نیلے بال زرد روشنی میں جھلملا رہے تھے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تاش میں مستغرق ہو چکی تھیں۔ منظور احمد وسیع، گہرے کمرے کی پرچھائیوں میں کہیں گم ہو گئے تھے اور اسسٹنٹ سیکرٹری اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اپنے ہاتھ کے پتوں پر غور کر رہا تھا۔

جب ہم لوگ کمرے سے باہر نکلے تو عنابی بنارسی ساری اور جھالر دار بلاؤز میں ملبوس ایک بھولی سی لڑکی دروازے میں مجھ سے ٹکرا گئی۔ اس نے بالوں کے گچھے سے بنا رکھے تھے۔ اور اس کی ساری میں جڑاؤ بروچ چمک رہا تھا میں نے چونک کر آنکھیں پوری طرح کھولیں اور شوبھا نے کہا " واقعی تم تو نیند سے لڑکھڑاتے جا رہی ہو۔ چلو جلدی سے گھر پہنچیں "

چنانچہ ہم لوگ تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگے۔

بڑے آدمی

ڈپٹی صاحب کی کوٹھی کے آنگن میں ذکیہ بیگم نواڑی پلنگ پر بیٹھی دلہن کے دوپٹے پر بچکا ٹانکنے میں بے طرح مصروف تھیں۔ جب ماما نے انہیں آواز دی تو وہ جلدی سے تلے دانی لپیٹ کر باورچی خانے کی طرف لپکیں۔ ڈپٹی صاحب کے گھر کی بیبیاں دعوت کا سارا انتظام ذکیہ بیگم کے سپرد کر کے مزے سے برآمدے میں چاندنی کے فرش پر بیٹھی جھنجھنوں کی طرح جھنجھنا رہی تھیں۔

"اے ذکیہ بٹیا ذرا آ کے بھیا کو چپ کرا جاؤ۔" چبوترے پر سے چھوٹی بھاوج نے آواز دی۔ "تم سے اتنا ہل گیا ہے بھیا، مجھ سے تو چپ ہی نہیں ہوتا۔"

" ذکیہ چند منٹ بعد باورچی خانے سے نکل کر چبوترے پر پہنچیں کھڑی کھڑی ٹیک کر بچے کو گھٹنوں پر بٹھایا اور بہلانا شروع کیا " آغوں غوٹے، ماموں موٹے، ممانی موٹی۔" بچہ روتے روتے فوراً چپ ہو گیا اور بیربہوٹی کی مانند آنکھیں جھپکا کر ذکیہ کے خوبصورت چہرے کو تکنے لگا۔

" اللہ ذکیہ جب گھر بن جائے گی اُجالا کر دے گی ،" برآمدے میں بیٹھی ایک مہمان بی بی نے ڈپٹی صاحب کی بڑی بہو سے کہا۔

" کیسی بات لگی ہے ؟" دوسری بی بی نے قریب کھسک کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ رازدارانہ لہجہ میں دریافت کیا۔

" اے بیٹا بنت ٹانک دی ———— ؟" دور سے ڈپٹیائن نے آواز لگائی۔

" ٹانک دی ———— " اَغوں غوٹے، ماموں موٹے ———— ذکیہ نے چبوترے پر بڑی محویت کے ساتھ اپنا وظیفہ جاری رکھا۔

" لے کہاں بہن ،" برآمدے میں ڈپٹی صاحب کی ساس نے ناک کی پھننگ پر عینک رکھ کر چہرہ اونچا کرتے ہوئے مہمان بیوی کو جواب دیا " آج کل لڑکے جہیز میں موٹریں مانگ رہے ہیں۔ وکیل صاحب دکھیا کے پاس کیا رکھا ہے اور تعلیم بھی کچھ نہیں، آج کل تو بی اے، ایم اے کی مانگ ہے ۔"

اتنے میں ذکیہ بچے کو چھوٹی بھاوج کے حوالے کر کے دوپٹہ سر پہ ڈالتی برآمدے میں آئیں تو لڑکیوں بالیوں نے انہیں گھیر لیا " اللہ ذکو بجیا ہمارا بلاؤز نراش دیجئے ۔" " بھئی ذکیہ تم بڑی بے مروّت ہو وعدہ کیا تھا۔ ہمارے لئے لیس بُن دو گی، بگھارے بینگن نہ لائیں ہمارے لئے ۔" ذکیہ ہنس ہنس کر یا جھلا کر سب کو جواب دیتی رہیں کہ ابھی بہت کام پڑا ہے۔ فرصت ملی تو تمہارا کام بھی کر دوں گی ۔" پھر انہوں نے ڈپٹیائن سے کہا " اللہ ڈپٹیائن چچی ہمیں گودام کی کنجی دے دیجئے تو چاول تلوا لیں ۔"

ڈپٹیائن نے کنجیوں کا گچھا انہیں تھمایا اور وہ خراماں خراماں گودام کی طرف

چلی گئیں۔

ڈپٹیائن سے ذکیہ بیگم کا کوئی رشتہ نہ تھا، مگر اس معاشرے میں وضعداری کی بنا پر سب ایک دوسرے کو کسی نہ کسی رشتے سے یاد کرتے تھے۔ ذکیہ بیگم کو یوں بھی اپنے سے اونچے رتبے والوں سے رشتے جوڑنے کا خاصا شوق تھا۔ اور ڈپٹیائن ایک تعلقہ دار کی بیٹی تھی۔ ویسے بھی ڈپٹی صاحب کے گھرانے کے علاوہ شہر کے دوسرے بہت سے کنبوں میں ذکیہ اپنے سگھڑاپے اور ملنساری کی وجہ سے بہت مقبول تھیں، ہر تقریب یا دعوت کا انتظام وہ منٹوں میں سنبھال لیتیں۔ عقیقے، بسم اللہ، گیارہویں شریف، بیاہ برات بارہ مہینے ان کی جان کے ساتھ کچھ نہ کچھ لگا ہی رہتا۔

بات اصل میں یہ تھی کہ ذکیہ کا جی اپنے گھر میں کبھی نہ لگا۔ اس نگوڑے ڈھنڈار مکان کے برآمدوں میں گھاس اُگ آئی تھی، کمروں کے اینٹوں کے فرش کو دریاں تک نہ جُڑی تھیں۔ قالین تو چھوڑیئے۔ بیٹھک میں وکیل صاحب کبھی کبھار آجھکنے والے موکلوں کے انتظار میں پڑے حقہ گڑگڑایا کرتے۔ اندر امّاں گاؤں سے آئی ہوئی دقیانوسی رشتے دار بڑھیوں سے سر کھپاتیں۔ باتیں کیا ہوتی تھیں۔ وہی گاؤں کے بھلیچر قصے کو سیتا پچا کو نترہ نیزی کے مہینے میں کھنڈ سال سے اتنا نفع ہوا —— اور وہ مولوی نشتن کا لڑکا تھا نا؟ وہ بھلبتی بھاگ گیا، اور مہراں جی اور شاہ دار کے مہینوں میں چھکّن کی بہو پر اد بدا کے شیخ سدو سوار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو انگریزی مہینوں کے نام تک تو نہیں آتے تھے۔ اور اماں کا یہ حال تھا کہ ان کے نزدیک بائیسکوپ کی موٹی تصویریں جادو کے زور سے بولتی تھیں۔

وکیل صاحب کانگریس اور خلافت کے چکر میں برسوں جیل میں رہے۔ رہائی کے بعد پریکٹس جمی نہیں۔ دمے کے مریض تھے۔ گاؤں سے تھوڑا بہت غلہ آجاتا تھا۔ ستا زمانہ تھا۔ سفید پوشی سے گزر ہو رہی تھی۔ ذکیہ بیگم کے لئے حسب حیثیت جہیز تیار ہو چکا تھا۔ وہ اکلوتی لڑکی تھی۔ کسی شریف غریب پیغام کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ اونچے طبقے کے لڑکے بھلا اس کھنڈر مکان کا رُخ کیوں کرنے لگے۔

وکیل صاحب بے چارے نے ذکیہ کو اسکول میں پڑھوایا۔ وہ پیدائشی سلیقہ مند تھیں۔ کرو شیا، کشیدہ کاری، سلائی، کھانا پکانا ہر چیز میں طاق تھیں، پڑھنے میں البتہ جی نہ لگتا۔ اس لئے آٹھویں کے بعد گھر بیٹھ گئیں۔ ڈپٹی صاحب کی کوٹھی پڑوس میں تھی۔ زیادہ تر وہیں رہتیں، قبول صورت اور نیک دل لڑکی تھیں نماز روزے کی پابند۔ ناول پڑھنے کی چاٹ انہیں ڈپٹی صاحب کے گھر ہی پڑی۔ پردہ کلب لائبریری کے سارے رومانی ناول گھول کر پی گئیں۔ اکثر خود کو کسی محل میں رہنے والی ہیروئن تصور کرتیں اور طرح طرح کے سہانے خواب اپنے مستقبل کے متعلق دیکھا کرتیں۔ شام کے وقت اپنی شکستہ کوٹھی کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ناول پڑھتے پڑھتے جانے کہاں کہاں پہنچ جاتیں۔ اتنے میں کسی موکل کا یکہ کھٹ کھٹ کرتا سامنے آکر رکتا اور سارا طلسم ٹوٹ جاتا چونکہ بہت معصوم تھیں، اس لئے اتنے ناول اور افسانے پڑھ لینے کے باوجود انہیں خود رومان لڑانے کی کبھی نہ سوجھی، مگر جب ان کی سہیلیاں اپنے رشتے کے بھائیوں سے در پردہ رومان لڑاتیں تو ذکیہ ان کی ہمدرد اور ناصح بنتیں، ان کے معاشقوں کی کامیابی کی دعا مانگتیں اور ناکامی کی صورت میں آنسو بہاتیں۔

چاول تلوا کر ذکیہ جب گودام سے نکلیں ایک دم غل مچا "لیڈی آ گئیں لیڈی صاحب آ گئیں" ڈپٹیائن پائنچے سنبھالتی ان کے استقبال کے لئے باہر لپکیں۔

باہر ایک طویل موٹر میں سے تین بے پردہ بیبیاں اتریں۔ دو ترشے ہوئے بالوں والی لڑکیاں تھیں، ایک ان کی اماں تھیں۔ سب بڑی تمکنت سے آ کر پچھلے برآمدے میں مسند پر بیٹھ گئیں۔

افراتفری میں چھوٹی بھاوج نے ذکیہ کو ان لوگوں سے ملوایا تک نہیں مگر کھانے کے بعد آفتابہ اٹھا کر مہمانوں کے ہاتھ دھلاتے وقت ذکیہ نے خود ہی لڑکیوں سے بات چیت شروع کر دی۔ یہ دونوں گلنار اور یاسمین مسز اعجاز اور لیڈی احمد کی لڑکیاں تھیں۔ مسز اعجاز حال ہی میں اس شہر میں آ کر رہے تھے۔ ہم عمر لڑکیوں میں پل کے پل میں دوستی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ذکیہ اور گلنار اور یاسمین میں بھی فوراً بہناپا قائم ہو گیا۔ لیڈی صاحب نے ذکیہ کو آئندہ ہفتے اپنے یہاں میلاد شریف کے لئے مدعو بھی کر ڈالا۔

گھر لوٹ کر ذکیہ نے بے حد مسرت کے ساتھ وکیل صاحب کو بتایا کہ "انہیں مسز اعجاز احمد کے یہاں مدعو کیا گیا ہے اور مسز اعجاز بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"انگریزوں کے پٹھو ہیں!" وکیل صاحب نے مختصراً کہا اور خلال کرنے میں مشغول رہے۔ لیکن اماں دل میں بہت خوش ہوئیں کہ بڑے گھرانے سے ملاقات ہو گئی۔ شاید اسی وسیلے سے کہیں اچھا رشتہ لگ جائے۔

بہت جلد ذکیہ لیڈی اعجاز کے گھرانے میں بھی رل مل گئیں۔ ہفتے میں ایک آدھ بار تو ضرور ہی ان کے وہاں پھیرا لگا آتیں۔ ایک روز ڈپٹی صاحب

کی بہو نے طعنہ دیا۔ بڑے آدمیوں سے دوستی ہوگئی ہے۔ شاید اسی لئے اب ہمارے یہاں نہیں آتیں ذکیہ۔"

"نہیں یہ بات نہیں، توبہ کرو بھابھی" ذکیہ نے شرمندہ ہو کر کہا۔ مگر واقعہ یہی تھا کہ ڈپٹیائن کے گھر کے فرسودہ ماحول کے مقابلے میں قصر اعجاز کی رومینٹنگ فضاؤں میں ذکیہ کا جی بہت زیادہ لگتا تھا۔ سر اعجاز کا اکلوتا لڑکا ولایت سے میم لے آیا تھا اور کسی دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ گلنار اور یاسمین سینیئر کیمبرج کرنے کے بعد اب شادی کے انتظار میں گھر پر بیٹھی تھیں اور "میوزک اینڈ پینٹنگ" سے شغف کر رہی تھیں اور انگریزوں والے کلب جا کر بیڈ منٹن کھیلتی تھیں۔ وہ دونوں بہت ہی معمولی شکل کی لڑکیاں تھیں گلنار بہت ہی بھدی تھی اور یاسمین کے داہنے پاؤں میں خفیف سا لنگ تھا۔ اسی وجہ سے باپ کی بے اندازہ دولت اور بڑے نام کے باوجود رشتے نہیں آرہے تھے۔

گلنار اور یاسمین کے لیے ذکیہ بیگم اپنے سلیقے کی وجہ سے بڑی کارآمد سہیلی ثابت ہوئیں۔ وہ ان کے کپڑے سیتیں۔ ان کے دوپٹے نہایت نفاست سے چنتیں، اُن کی پارٹیوں کا انتظام کرتیں اور لیڈی صاحب کے اصرار پر رات کو بھی اکثر وہیں ٹھہر جاتیں۔ چونکہ ان کے گھر میں کوئی جوان مرد نہ تھا، اور سر اعجاز بزرگ آدمی تھے۔ اس لیے وکیل صاحب نے بھی ذکیہ کے قصر اعجاز میں راتیں گزارنے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

قصر اعجاز کا ماحول بے حد نادلانہ تھا۔ اس لئے ذکیہ جو کو اب بائی عدہ ایک

رومانی کردار سمجھنے لگی تھیں۔ اب وہ گلنار اور یاسمین کی طرح سر اعجاز اور لیڈی صاحب کو ڈیڈی اور ممی کہتیں اور لیڈی اعجاز بھی ان سے بڑی محبت کا سلوک کرتی تھیں۔ وہ اکثر کہتیں "مجھ کو خدا نے ایک پیاری پیاری سگھڑ بیٹی دے دی، میری لڑکیاں تو دونوں بالکل نکمی ہیں۔" ذکیہ یہ سن کر باغ باغ ہو جاتیں مگر بڑی صدق دلی سے گلنار اور یاسمین کی طرف داری کرنے لگتیں۔

ایک شام کو ذکیہ حسب معمول سائیکل رکشہ پر پردہ بند ہوا کر قصر اعجاز گئیں تو معلوم ہوا کہ لیڈی صاحب اور دونوں لڑکیاں کلب جا چکی ہیں، سر اعجاز وائسرائے سے ملنے دہلی گئے ہوئے تھے۔ ذکیہ اطمینان سے باغ میں ٹہلتی رہیں کہ اتنے میں ایک کار آ کر رکی اور ایک بڑا خوب صورت نوجوان نیچے اترا۔ ذکیہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں گلاب کی کیاری کے پاس کھڑی بہت دلکش معلوم ہو رہی تھیں۔ نووارد ان کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ پھر چند لمحوں بعد کھنکار کر ذرا گھبراتے ہوئے اس نے کہا "معاف کیجئے گا —— سر اعجاز تشریف رکھتے ہیں؟"

ذکیہ نے چونک کر نوجوان کو دیکھا اور بڑی سادگی اور اخلاق سے جواب دیا، "جی نہیں —— ڈیڈی تو دلی گئے ہوئے ہیں —— ممی ابھی کلب سے آتی ہی ہوں گی، تشریف رکھئے۔"

نوجوان جس کا نام ظفر احمد تھا، ان کو تکتے تکتے جھینپ کر گھاس پر بچھی کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔

"چائے پیجئے گا یا شربت؟" ذکیہ نے پوچھا۔

ذکیہ فوراً اندر گئیں اور چند منٹ بعد چاندی کی ٹرے پر شربت کا گلاس رکھ کر باہر لائیں اور بڑی شائستگی سے گلاس مہمان کو پیش کیا۔

"کیا سادگی اور معصومیت ہے۔" ظفر احمد نے کھڑے ہو کر گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے سوچا۔ "اتنے بڑے آدمی کی لڑکی، اور بیرے کو آواز دینے کی بجائے خود شربت لے کر آ گئی۔ کمال ہے۔"

"آپ یہیں کالج میں پڑھتی ہیں؟" ظفر احمد نے دریافت کیا۔

"جی نہیں۔" ذکیہ نے دوسری کرسی پر ٹکتے ہوئے جواب دیا "میرا دل" انہوں نے ذرا جھینپ کر کہا "خانہ داری میں زیادہ لگتا ہے۔" اچانک انہیں احساس ہوا کہ وہ ایک اجنبی نوجوان سے اس قدر بے تکلفی سے باتیں کر رہی ہیں۔ گلاب کی کلی کی طرح سُرخ ہو کر انہوں نے گلاب کی ایک پنکھڑی توڑی —— چند لمحوں تک بڑی گمبھیر خاموشی چھائی رہی، جس میں باغ کے درخت اور پھول شام کی ہوا میں سرسرایا کئے۔ ظفر احمد بھی بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ شربت ختم کر کے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور گھڑی دیکھ کر بولے "اب اجازت دیجئے۔ دل تو بہت چاہ رہا ہے کہ کچھ دیر اور یہاں بیٹھوں مگر مجھے رات کی ٹرین پکڑنا ہے۔ لیڈی صاحبہ نہ جانے کس وقت تک یہاں آئیں گی۔ میری ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی، میں دراصل اس شہر میں آج ہی آیا ہوں، آپ کے ڈیڈی سے ایک ضروری کام تھا، میں ان سے بھی پہلے کبھی نہیں ملا ہوں۔ افسوس ہے کہ آج بھی ملاقات نہ ہو سکی۔"

"ممی تو بلڈ پریشر کی وجہ سے کہیں آتی جاتی نہیں ہیں، مگر آج گلنار اور یاسمین

کا بیڈمنٹن میچ تھا۔ اس لئے چلی گئیں۔"

"گلنار اور یاسمین کون ہیں؟ آپ کی چھوٹی بہنیں؟"

"جی ——۔ جی ——" ذکیہ نے ایک دم بے حد سراسیمہ ہو کر کہا کیونکہ ظفر احمد ان کی کرسی کے بالکل قریب آکر بے حد دلچسپی اور جذبے کے ساتھ ان کو دیکھ رہے تھے۔ ذکیہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں اور دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ کر پھاٹک کی طرف نظریں گھما دیں۔

"اب مجھے واقعی چل دینا چاہیئے۔" ظفر احمد نے گہری آواز میں کہا "اچھا آداب عرض۔"

"اللہ حافظ۔" ذکیہ نے سادگی سے جواب دیا۔ ظفر احمد کا دل اس ادا پر شدت سے دھڑک اٹھا۔ اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے کار کی طرف چلے گئے۔ چند لحظوں بعد کار پھاٹک سے باہر نکل گئی۔

ظفر احمد الہ آباد کے ایک متوسط گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ لندن میں ڈاکٹری پڑھ رہے تھے اور شادی کے ارادے سے وطن واپس آئے تھے۔ مگر سر اعجاز کے یہاں وہ شادی کے ارادے سے نہیں آئے تھے وہ کسی اونچے گھرانے کی فیشن ایبل لڑکی سے بیاہ کرنا ہرگز نہیں چاہتے تھے۔ برسوں لندن میں رہنے کے بعد بھی وہ ایک ٹھیٹھ ہندوستانی لڑکی کو شریک حیات بنانے کے خواہاں تھے وہ چاہتے تھے کہ کسی سیدھی سادی اور غریب گھرانے کی لڑکی کو بیاہ کر اپنے ساتھ لندن لے جائیں۔ مگر اس وقت ذکیہ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ ایسی بھولی بھالی اور نیک طبیعت لڑکیاں بھی اس اونچے اور فیشن ایبل

طبقے میں موجود ہیں۔ تو اگر ڈھیر ساری دولت بھی مل جائے تو کیا حرج ہے؟

کوئی دس روز کے بعد الہ آباد سے ظفر احمد کی والدہ کا خط لیڈی اعجاز کے پاس آیا۔ اپنا اور اپنے خاندان کا تعارف کرانے کے بعد انہوں نے لکھا تھا۔

"آپ کے دولت خانے پہ آپ کی بڑی صاحبزادی سے میرے لڑکے نور چشمی ظفر احمد سلمہ کی اتفاقیہ ملاقات ہو گئی۔ بہن صاحبہ، آپ جانتی ہی ہوں گی کہ آج کل کے لڑکے نئی وضع کی لڑکیوں کے ذکر ہی پہ کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں۔ مگر آپ کی صاحبزادی بلند اقبال کے حسنِ صورت و سیرت سے عزیزی ظفر احمد بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ یہ یقیناً آپ کی اور سر اعجاز کی دی ہوئی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ آپ کی بیٹی آج کل کی ماڈرن لڑکی معلوم ہی نہیں ہوتی ـــــــــ" وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں لکھا تھا کہ ظفر احمد سلمہ شادی جلد از جلد کر کے اس مہینہ کے آخر میں اللہ رکھے دلہن کے ساتھ واپس ولایت جانا چاہتے ہیں۔

لیڈی اعجاز یہ خط پڑھ کر ہکا بکا رہ گئیں۔ خط میں جس تاریخ کا ذکر تھا اس کو تو گلنار اور یاسمین گھر پر ہی نہیں تھیں۔ اور حسن و صورت و سیرت؟ یا مظہر العجائب!

ٹھیک اس وقت لیڈی صاحبہ نے دیکھا کہ ذکیہ بی بی گلنار کا سویٹر بُنتی خراماں خراماں سامنے سے چلی آ رہی ہیں، لیڈی صاحبہ نے ہڑبڑا کر پوچھا۔ "بیٹا، جس روز گلنار اور یاسمین کا کلب میں میچ تھا، تم یہاں کس سے ملی تھیں؟"

"کوئی ظفر صاحب تھے ممی۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ ڈیڈی سے ملنے کوئی صاحب آئے تھے۔ میں نے ان کو شربت لاکر دے دیا تھا۔ چائے کے لئے وہ مانے ہی نہیں۔"

"اوہ ــــــ" لیڈی اعجاز کی سمجھ میں ساری بات آگئی۔

پیغام فی الفور منظور کر لیا گیا ــــــ اور گلنار یالوں بٹھادی گئی۔ اگلے ہفتے جب دولہا والیاں الہ آباد سے چل کر آئیں تو ان سے کہہ دیا گیا کہ ہمارے یہاں نکاح سے پہلے لڑکی دولہا کی ماں بہنوں تک کو نہیں دکھائی جاتی۔ ظفر احمد کی والدہ اتنے اونچے گھرانے میں بیٹے کا رشتہ ہو جانے سے اس قدر خوش تھیں۔۔ کہ انہوں نے لڑکی دیکھنے پہ مطلق اصرار نہ کیا۔ سر اعجاز ایک نہایت شریف اور راست باز انسان تھے اس لئے لیڈی صاحبہ نے ان کو یہ بالکل نہیں بتایا کہ ظفر احمد سلمہ، دراصل بے چاری خستہ حال ذکیہ پہ عاشق ہوئے تھے۔

بیاہ کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ ذکیہ بیگم جی جان سے انتظامات میں جُٹ گئیں۔ اس قدر دھوم دھام کی شادی تھی کہ بس دیکھا ہی کیجئے۔ ذکیہ نے اپنی اماں کو بھی پہنا اُڑھا کر لا کے پچھلے دالان میں ایک طرف بٹھا دیا تھا اور پانوں کا انچارج انہیں بنا دیا گیا وہ بے چاری بڑے گھر کی اس شادی سے مرعوب اور متحیر تخت پر بیٹھی مشین کی طرح گلوریوں پہ گلوریاں بناتی رہیں۔

بیاہ کے روز ذکیہ ملازموں پہ چیختی چلاتی پھر رہی تھیں کہ برات آگئی۔ اور کچھ دیر بعد زنان خانے میں شور مچا "دولہا آگیا ــــــ دولہا آگیا ــــــ ہائے کتنا شاندار ہے۔ بالکل شہزادہ!" مہمان لڑکیوں میں کھسر پُھسر شروع ہوئی۔ گلنار

کی صورت دیکھو اور یہ دولہا!" بلکہ ڈپٹیائن کی مونہہ پھٹ بہو نے تو چپکے سے اپنی نند سے یہ تک کہا "عجب تر ہی قدرت عجب تر ہے کھیل! دوسرا مصرع کیا ہے بجیا؟ مجھے یاد نہیں آرہا!" اور ڈپٹیائن کی لڑکی نے ہونٹ پچکا کر مسکراتے ہوئے جواب دیا "اللہ بھابھی اب چُپ رہو۔"

"اے آرسی مصحف کس وقت ہوگا؟" ڈپٹی صاحب کی ساس نے سامنے سے گزرتی ہوئی ذکیہ سے دریافت کیا۔ جو پھولوں کی ٹوکری اٹھائے دلہن کے کمرے کی طرف بھاگی جارہی تھیں۔

"گلنار بے چاری کے سر میں سخت درد ہے۔ خالہ جان۔ ممی نے کہہ دیا ہے۔ کہ آرسی مصحف نہیں ہوگا۔ وہ بیٹھ تک تو سکتی نہیں غریب۔ سر مونہہ لپیٹے پڑی ہے" ذکیہ نے جلدی جلدی جواب دیا اور جھپاک سے اندر چلی گئیں۔

لیکن ذکیہ کو دولہا کا جوتا چرانے کا بڑا ارمان تھا ــــــ سمدھیانے والوں کے اصرار پہ دلہن کو اس کی ایک لیڈی ڈاکٹر دوست اور دوسری سہیلیاں سہارا دے کر ہال میں لائیں اور مسند پہ بٹھا دیا۔ اس کا چہرہ تو بھاری سہرے میں چھپا ہوا تھا۔ گٹھڑی سی بن کر وہ گاؤ تکیے کے سہارے لیٹ رہی۔ اور گرد عورتوں اور بچوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ شگون کے لئے آئینہ اور قرآن شریف بھی لا کر پاس رکھ دیا گیا۔ پھر دوبارہ غل مچا اور ظفر احمد جن کا چہرہ تمتما رہا تھا سہرے میں چھپے وقار سے چلتے اندر آ کر مسند پہ بیٹھے اور آہستہ سے کہا "اگر آپ کی طبیعت خراب ہے تو آپ اس ہنگامے میں آکر کیوں بیٹھ گئیں؟ آپ بھی حد کرتی ہیں۔ جائیے جا کر لیٹ رہیئے۔

دلہن یہ سن کر اور دوہری ہو گئی۔ اتنے میں یاسمین اور دوسری لڑکیاں جوتا چرانے کے لیے لپکیں۔

چند منٹ پہلے ذکیہ کو باورچی خانے میں اطلاع پہنچی تھی۔ کہ دلہا اندر آنے والا ہے، اور وہ فوراً ہال کی سمت روانہ ہونے والی ہی تھیں۔ مگر عین اسی وقت لیڈی اعجاز ان کے پاس پہنچیں اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی ان کو زینے پر لے گئیں "بیٹا کیا غضب کرتی ہو؟ تم یہاں باورچی خانے میں گھسی بیٹھی ہو۔ اور اوپر جہیز کا سامان کھلا پڑا ہے۔ سب کی سب اتر کر دلہا کو دیکھنے چلی گئیں۔ تم فوراً جاؤ اوپر۔ ایک منٹ کو وہاں سے نہ ہلنا۔ تمہاری ذمہ داری ہے۔ غضب خدا کا! بہن کے ہزاروں روپے کے زیور کھلے پڑے ہیں اور تم یوں بے پروا گھوم رہی ہو!"

"ابھی جاتی ہوں ممی۔" ذکیہ نے جواب دیا اور جوتا چرانے کا ارمان دل میں لیے اوپر جہیز کے کمرے میں جا کر زیورات کے شوکیس کے پاس بیٹھ گئیں۔ جس میں تیز برقی قمقمے جل رہے تھے۔ "واقعی ممی مجھے اپنے سگے عزیزوں سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔" انہوں نے دل میں کہا اور بیٹھی جہیز دکھاتی رہیں۔

کچھ دیر بعد رخصتی کا وقت آیا۔ نیچے لان پر سے پولیس بینڈ کی آواز بلند ہوئی۔ ذکیہ نے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ رشتہ داروں کے جمگھٹ میں گھرا ہوا دلہا گلنار کو سہارا دے کر کار میں بٹھا رہا تھا۔ وہ اسی طرح گھڑی بنی ہوئی تھی۔ ذکیہ کو رنج تھا کہ اس وقت نیچے جا کر اپنی پیاری سہیلی کو خدا حافظ نہ کہہ سکیں مگر یہ اطمینان بھی رہا کہ اس کھڑکی میں سے رخصتی کا سارا ہنگامہ کرتا نظارہ انہیں بہت اچھی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

برات دلہن کو لے کر روانہ ہو گئی۔ ذکیہ بیگم جہیز کا کمرہ لیڈی اعجاز کی خالہ کے سپرد کر کے "کاہے کو بیاہی بدیس" گنگناتی خوش خوش نیچے اتریں اور رات کی دعوت کی دیکھ بھال کرنے کی غرض سے پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

دوسرے دن، دستور کے مطابق لیڈی اعجاز نے گلنار کے سارے کنوار پتے کے زمانے کے کپڑے اس کی بن بیاہی بہن ذکیہ کو دے دیئے۔

فوٹوگرافر

موسم بہار کے پھولوں سے گھرا بے حد دلفریب گیسٹ ہاؤس ہرے بھرے ٹیلے کی چوٹی پر دور سے نظر آجاتا ہے ٹیلے کے عین نیچے پہاڑی جھیل ہے۔ ایک بل کھاتی سڑک جھیل کے کنارے کنارے گزرتی گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک پہنچتی ہے۔ پھاٹک کے نزدیک دار لرس کی ایسی مونچھوں والا ایک فوٹوگرافر اپنا سازو سامان پھیلائے ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گم نام پہاڑی قصبہ ٹورسٹ علاقہ میں نہیں ہے۔ اس وجہ سے بہت کم سیاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہ عسل منانے والا جوڑا یا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آپہنچتا ہے تو فوٹوگرافر بڑی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کیمرہ سنبھالے باغ کی سڑک پر ٹہلنے لگتا ہے۔ باغ کے مالی سے اس کا سمجھوتہ ہے۔ گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نوجوان خاتون کے لئے صبح سویرے گلدستہ لے جاتے وقت مالی فوٹوگرافر کو اشارہ کر دیتا ہے اور جب ماہِ عسل منانے والا جوڑا ناشتے کے بعد نیچے باغ میں آتا ہے تو مالی اور فوٹوگرافر دونوں ان کے انتظار میں

چوکس ملتے ہیں۔ فوٹو گرافر مدتوں سے یہاں موجود ہے۔ نہ جانے اور کہیں جاکر اپنی دوکان کیوں نہیں سجاتا۔ لیکن وہ اسی قصبہ کا باشندہ ہے۔ اپنی جھیل اور پہاڑی چھوڑ کر کہاں جائے۔ اس پھاٹک کی پلیا پر بیٹھے بیٹھے اس نے بدلتی دنیا کے رنگا رنگ تماشے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے۔ برطانوی پلانٹرز، سفید سولا ہیٹ پہنے کولونیل سروس کے جغادری عہدے دار، ان کی میم لوگ اور بابا لوگ۔

رات رات بھر شرابیں اڑائی جاتیں اور گراموفون ریکارڈ چیختے تھے اور گیسٹ ہاؤس کے نچلے ڈرائنگ روم کے چوبی فرش پہ ڈانس ہوتا تھا۔ دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے۔ پھر ملک کو آزادی ملی، اکا دکا سیاح آنے شروع ہوئے، یا سرکاری افسر یا نئے بیاہے جوڑے یا مصور یا کلاکار، ایسے لوگ جو تنہائی چاہتے ہیں، ایسے لوگ جو برسات کی شاموں کو جھیل پر جھکی دھنک کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی تھے۔ جس کا زندگی میں وجود نہیں۔ کیونکہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے۔ ہم جہاں ٹھہرتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے، فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی آؤ جاؤ جاری ہے۔ فوٹو گرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

ایک روز شام پڑے ایک نوجوان اور ایک لڑکی گیسٹ ہاؤس میں آن کر اترے۔ یہ دونوں انداز سے ماہ عسل منانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بے حد مسرور اور سنجیدہ سے۔ وہ اپنا مختصر سامان اٹھائے اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی پڑی تھی۔ زینے کے برابر میں ڈرائنگ ہال تھا اور اس کے بعد

تین بیڈ روم۔

"یہ کمرہ میں لوں گا۔" نوجوان نے پہلے بیڈ روم میں داخل ہو کر کہا۔ جس کا رُخ جھیل کی طرف تھا۔ لڑکی نے اپنی سُرخ چھتری اور کوٹ اس کمرے کے ایک پلنگ پہ پھینک دیا۔

"اُٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔" نوجوان نے اس سے کہا۔

"اچھا۔" لڑکی دونوں چیزیں اُٹھا کر برابر کے سٹنگ روم سے گزرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی، جس کے پیچھے ایک پختہ گلیارا سا تھا۔ کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے وہ مزدور نظر آ رہے تھے جو ایک سیڑھی اُٹھائے پچھلی دیوار کی مرمت میں مصروف تھے۔

ایک بیرا لڑکی کا سامان لے کر اندر آیا، اور دریچوں کے پردے برابر کر کے واپس چلا گیا۔ لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کر کے سٹنگ روم میں آ گئی۔ نوجوان آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پہ بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اُس نے نظریں اُٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ باہر جھیل پہ دفعتہً اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ دریچے میں کھڑی ہو کر باغ کے دھندلکے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پہ بیٹھ گئی۔ نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے رہے۔ فوٹو گرافر جراب بھی نیچے پھاٹک پر بیٹھا تھا۔ اُس کا کیمرہ آنکھ رکھتا تھا۔ لیکن سماعت سے عاری تھا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے اور دریچے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر قصبے کی روشنیاں جھلملا اُٹھی تھیں۔ اس وقت تک ایک یورپین سیاح بھی گیسٹ ہاؤس میں آ چکا تھا۔ وہ

خاموش ڈائننگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا تھا۔ چند پکچر پوسٹ کارڈ اُس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔

"یہ اپنے گھر خط لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پر اسرار مشرق کے پر اسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سرخ ساری میں ملبوس ایک پر اسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔" "بڑا ہی رومانٹک ماحول ہے،" لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی ہنس پڑا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سٹنگ روم میں آ گئے۔ نوجوان اب اُسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رات گہری ہوتی گئی۔ دفعتہً لڑکی کو زور کی چھینک آئی اور اُس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔

"اب سونا چاہیئے، تم اپنی زکام کی دوا پینا نہ بھولنا،" نوجوان نے فکر سے کہا۔

"ہاں۔ شب بخیر۔" لڑکی نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی۔ پیچھے گلیارے میں گھپ اندھیرا تھا۔ کمرہ بے حد پُر سکون خنک اور آرام دہ تھا۔ زندگی بے حد پُر سکون اور آرام دہ تھی۔ لڑکی نے کپڑے تبدیل کر کے سنگھار میز کی دراز کھول کے دوا کی شیشی نکالی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے اپنا سیاہ کیمونو پہن کر دروازہ کھولا۔ نوجوان ذرا گھبرایا ہوا سا سامنے کھڑا تھا۔ "مجھے بھی بڑی سخت کھانسی اُٹھ رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"اچھا ——— !" لڑکی نے دوا کی شیشی اور چمچہ اُسے دیا۔ چمچہ نوجوان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اُس نے جھک کر چمچہ اٹھایا اور اپنے کمرے کی

طرف چلا گیا۔ لڑکی روشنی بجھا کر سو گئی۔

صبح کو وہ ناشتے کے لیے ڈرائنگ روم میں گئی۔ زینے کے برابر والے ہال میں پھول مہک رہے تھے۔ تانبے کے بڑے بڑے گلدان براسو سے چمکائے جانے کے بعد ہال کے جھلملاتے چوبی فرش پہ ایک قطار میں رکھ دیئے گئے اور تازہ پھولوں کے انبار اُن کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ باہر سورج نے جھیل کو روشن کر دیا تھا اور زرد و سفید تتلیاں سبزے پہ اُڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد نوجوان ہنستا ہوا زینے پر نمودار ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گچھا تھا۔

" مالی نیچے کھڑا ہے۔ اُس نے یہ گلدستہ تمہیں بھجوایا ہے۔"

اُس نے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اور گلدستہ میز پر رکھ دیا۔ لڑکی نے ایک شگوفہ اُٹھا کر بے خیالی سے اپنے بالوں میں لگا لیا۔ اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

" ایک فوٹوگرافر بھی نیچے منڈلا رہا ہے۔ اُس نے بڑی سنجیدگی سے تمہارے متعلق دریافت کیا کہ کیا تم فلاں فلم اسٹار تو نہیں؟" نوجوان نے کرسی پہ بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنس پڑی۔ وہ ایک نامور رقاصہ تھی۔ مگر اس جگہ پر کسی نے اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نوجوان لڑکی سے بھی زیادہ مشہور موسیقار تھا۔ مگر اسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکتا تھا۔ ان دونوں کو اپنی اس عارضی گم نامی اور مکمل سکون کے یہ مختصر لمحات بہت بھلے معلوم ہوتے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے یورپین نے آنکھیں اُٹھاکر ان دونوں کو دیکھا اور ذرا سا مسکرایا وہ بھی ان دونوں کی خاموش مسرّت میں شریک ہو چکا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں نیچے گئے، اور باغ کے کنارے گل مہر کے نیچے کھڑے ہوکر جھیل کو دیکھنے لگے۔ فوٹو گرافر نے اچانک چھلاوے کی طرح نمودار ہوکر بڑے ڈرامائی انداز میں ٹوپی اتاری۔ اور ذرا جھک کر کہا۔

"فوٹو گراف لیڈی؟"

لڑکی نے گھڑی دیکھی "ہم لوگوں کو ابھی باہر جانا ہے، دیر ہو جائے گی؟"

"لیڈی ——" فوٹو گرافر نے پاؤں منڈیر پہ رکھا، اور ایک ہاتھ پھیلاکر باہر کی دنیا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "باہر کارزارِ حیات میں گھمسان کا رَن پڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ دیکھئے اس جھیل کے اوپر دھنک پل کی پل میں غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا۔ ادھر آئیے!"

"بڑا لسّان فوٹو گرافر ہے۔" لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا۔

مالی جو گویا اب تک اپنے کیو کا منتظر تھا، دوسرے درخت کے پیچھے سے نکلا اور لپک کر ایک اور گلدستہ لڑکی کو پیش کیا لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اور اس کا ساتھی امرسندری پاروتی کے مجسمے کے قریب جاکر کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آرہی تھی اس لئے اس نے مسکراتے

ہوئے آنکھیں ذرا سی چندھیا دی تھیں۔

کلک۔ کلک۔ تصویر اتر گئی۔

"تصویر آپ کو شام کو مل جائے گی۔ تھینک یو لیڈی۔ تھینک یو سر" فوٹو گرافر نے ذرا سا جھک کر دوبارہ ٹوپی چھوئی۔

لڑکی اور اس کا ساتھی کار کی طرف چلے گئے۔

سیر کر کے وہ دونوں شام پڑے لوٹے اور سندھیا کی نارنجی روشنی میں دیر تک باہر گھاس پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ جب کہر اگرنے لگا تو اندر نچلی منزل کے وسیع اور خاموش ڈرائنگ روم میں نارنجی قمقموں کی روشنی میں آ بیٹھے۔ نہ جانے وہ کیا باتیں کر رہے تھے۔ جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جا رہے تھے اور اپنی باتوں کی محویت میں ان کو فوٹو گرافر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر بھی یاد نہ رہی تھی۔

صبح کو لڑکی اپنے کمرے ہی میں تھی۔ جب بیرے نے اندر آ کر ایک لفافہ پیش کیا۔ "فوٹو گرافر صاحب یہ رات کو دے گئے تھے۔" اس نے کہا۔

"اچھا، اس سامنے والی دراز میں رکھ دو۔" لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور بال بنانے میں جٹی رہی۔

ناشتے کے بعد سامان باندھتے ہوئے اُسے وہ دراز کھولنا یاد نہ رہا اور جاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی نیچے جا کر کار میں بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کر دی۔ کار پھاٹک سے باہر نکلی۔ فوٹو گرافر

نے پلیا پر سے اُٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ ہلائے۔ کار ڈھلوان سے نیچے اُتر گئی۔

وہ دالرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹو گرافر ——— اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اور اسی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر ٹین کی کرسی بچھائے بیٹھا ہے اور سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے، جو اب نئی فضائی سروس شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔

لیکن اس وقت ایرپورٹ سے جو ٹورسٹ کوچ آکر پھاٹک میں داخل ہوئی۔ اس میں سے صرف ایک خاتون اپنا اٹیچی کیس اٹھائے برآمد ہوئیں اور ٹھٹھک کر انہوں نے فوٹو گرافر کو دیکھا جو کوچ کو دیکھتے ہی فوراً اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مگر کسی جوان اور حسین لڑکی کے بجائے ایک ادھیڑ عمر کی بی بی کو دیکھ کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی ٹین کی کرسی پہ بیٹھ چکا تھا۔

خاتون نے دفتر میں جا کر رجسٹر میں اپنا نام درج کیا اور اوپر چلی گئیں۔ گیسٹ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے روانہ ہوئی تھی۔ اور بیرے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر چکے تھے۔ تانبے کے گلدان تازہ پھولوں کے انتظار میں ہال کے فرش پر رکھے جھل جھل کر رہے تھے اور ڈائننگ ہال میں دریچے کے نیچے سفید براق میز پر چھری کانٹے جگمگا رہے تھے۔ نو وارد خاتون درمیانی بیڈ روم میں سے گزر کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آکر جھیل کو دیکھنے لگیں۔ چائے کے بعد وہ خالی سٹنگ روم میں جا بیٹھیں اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئیں۔ گلیارے میں سے کچھ پرچھائیوں

نے اندر جھانکا تو وہ اُٹھ کر دریچے میں گئیں جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار سے لگی چھوڑ گئے تھے۔ گلیارا ابھی سنسان پڑا تھا۔ وہ پھر پلنگ پر آکر لیٹیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انہوں نے دروازہ کھولا۔ باہر کوئی نہ تھا۔ سٹنگ روم بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ وہ پھر آکر لیٹ رہیں۔ کمرہ بہت سرد تھا۔

صبح کو اُٹھ کر انہوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگھار میز کی دراز کھولی تو اس کے اندر بچھے پیلے کاغذ کے نیچے سے ایک لفافے کا کونا نظر آیا۔ جس پر ان کا نام لکھا۔ خاتون نے ذرا عجب سے لفافہ باہر نکالا۔ ایک کاکروچ کاغذ کی تہ سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آ گیا۔ انہوں نے دہل کر انگلی جھٹکی اور لفافہ میں سے ایک تصویر سرک کر نیچے گر گئی، جس میں ایک نوجوان اور ایک لڑکی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک گم سُم اس تصویر کو دیکھتی رہیں۔ اور پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بیرے نے باہر سے آواز دی کہ ایئرپورٹ جانے والی کوچ تیار ہے۔ خاتون نیچے گئیں۔ فوٹوگرافر نئے مسافروں کی تاک میں باغ کی سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا۔

"کمال ہے پندرہ برس میں کتنی بار اس سنگھار میز کی صفائی کی گئی ہوگی۔ مگر یہ تصویر کاغذ کے نیچے اسی طرح پڑی رہی۔" پھر ان کی آواز میں جھلاہٹ آ گئی۔ "اور یہاں کا انتظام اتنا خراب ہو گیا ہے۔ کہ کمرے میں کاکروچ ہی کاکروچ ہیں۔"

فوٹوگرافر نے چونک کر ان کو دیکھا، اور پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر خاتون کے جھرّیوں والے چہرے پر نظر ڈال کر البم سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ خاتون کہتی رہیں۔ اُن کی تو آواز بھی بدل چکی تھی۔ چہرے پر درشتی اور سختی تھی۔ اور انداز میں چڑچڑا پن اور بے نیازی۔ اور وہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھیں۔

"میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں۔ اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا۔ میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے رات کی رات یہاں ٹھہر گئی تھی۔ نئی ہوائی سروس شروع ہو گئی ہے نا۔ یہ جگہ راستہ میں پڑتی ہے۔

"اور ——اور ——آپ کے ساتھی —— ؟" فوٹوگرافر نے آہستہ سے پوچھا۔

کوچ نے ہارن بجایا۔

"آپ نے کہا تھا نا کہ کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ اسی گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔

"اور اُن کو کھوئے ہوئے بھی مدت گزر گئی"۔ اچھا خدا حافظ۔

خاتون نے بات ختم کی اور تیز تیز قدم رکھتی کوچ کی طرف چلی گئیں۔

دالرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر پھاٹک کے نزدیک جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زندگی انسان کو کھا گئی۔

صرف کاگذ کے پھول باقی رہیں گے۔

سنگھار دان

لکھنؤ میں ہمارے ایک دور کے عزیز نواب اغن کہلاتے تھے۔ آج سے کوئی اسی بچاسی برس پہلے کا واقعہ ہے، جب نواب اغن کے دادا جائداد یا شاید وثیقے کے مقدمے کی پریوی کونسل میں اپیل کے سلسلے میں انگلستان گئے تھے اور وہاں سے میم بیاہ لائے تھے۔ اُن بی بی نے لکھنؤ آکر بڑی آن بان کی پردہ دار بیگم کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ محرم میں باقاعدہ عزاداری کرتی تھیں اور سنا ہے کچھ عرصہ بعد انگریزی بولنا بھی بھول گئی تھیں۔ پتہ نہیں اس میں زیبِ داستاں کو کہاں تک دخل ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی بیٹیاں، پوتیاں جن سے بھی ملی ہوں خالص دقیانوسی لکھنوی بیگمات تھیں جو انگریزی کا ایک لفظ نہ جانتی تھیں۔ ان سب کی کنجی آنکھیں اور بھورے بال تھے۔ اس کے سوا ان میں اور دوسری پردہ دار بیگمات میں کوئی فرق نہ تھا۔ یہ خاندان "گوری دادی کا گھرانا کہلاتا تھا"، اور ان کا مکان جو سبزی منڈی میں تھا "گوری بی بی کی حویلی" کے نام سے مشہور تھا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ گلابی جاڑوں کے دن تھے اور ہم فیض آباد روڈ سے کسی خاندانی تقریب میں شرکت کے لئے گوری بی بی کی حویلی گئے ہوئے تھے۔ میں اور گوری دادی کی پرپوتی ام لیلیٰ جو میری ہم عمر تھی، کھیلتی ہوئی دوسری منزل کے عقبی چھجے پر جا نکلیں۔ جس کے مقابل گلی کی دوسری جانب ایک سبز رنگ کی دو منزلہ عمارت استادہ تھی اور اس کی دوسری منزل کے رنگ برنگے شیشوں والے دروازوں اور کھڑکیوں پر موتیوں کے پردے پڑے تھے۔ نچلی منزل میں شاید دکانیں تھیں۔ مکان کے صدر دروازے کی پیشانی پر جلی حروف میں "پرستان منزل" نقش تھا۔ ہمارے طویل چھجے کے ایک کونے سے "پرستان منزل" کا عقبی صحن صاف نظر آرہا تھا۔ جس میں ایک گھوڑا گاڑی کھڑی تھی۔ اور دو مہریاں آپس میں زور زور سے لڑ رہی تھیں۔ اور ام لیلیٰ چھجے کی ریلنگ پر جھک کر مہریوں کی لڑائی کا دلچسپ تماشا دیکھنے لگیں۔ اتنے میں ایک سانولی سی بی بی، کمر تک سیاہ گھنے بال بکھرائے، صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں ملبوس پرستان منزل کی اس بالکنی میں نمودار ہوئیں جس کا رخ اس صحن کی طرف تھا۔ انہوں نے کمر پہ ہاتھ رکھ کر مہریوں کو ڈانٹا۔ اور ان کی ناک کی ہیرے کی لونگ دھوپ میں زور سے چمکی۔

انہیں دیکھتے ہی ام لیلیٰ نے مجھ سے کہا "چلو واپس چلیں"

"کیوں!" میں نے پوچھا۔

"یہ جو عورت ہے۔ اس کا نام حسن پری ہے۔ اس پہ نظر پڑ جائے تو گناہ ہوتا ہے۔"

"کیوں؟"

"ہمارے یہاں آٹھویں تاریخ کو مردانی مجلس میں آکر نوحہ بھی پڑھنی ہے۔"

"اس کا نوحہ سننے سے گناہ نہیں ہوتا؟"

لیکن اُمِّ لیلیٰ نے میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے جلدی سے سرگوشی میں کہا۔ "آؤ تمہیں زمرد پری بھی دکھا دیں۔"

میں چھجے میں سے گزر کر اُمِّ لیلیٰ کے پیچھے پیچھے ایک زینے میں پہنچی جس کے موکھے میں سے پرستان منزل کا بڑا کمرہ بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ کیونکہ اس کے گلی کے رُخ کے دروازے اور کھڑکیاں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں اور دھوپ کے لئے موتیوں کے پردے ایک طرف کو سرکا دیئے گئے تھے۔ کمرے میں شفاف سفید براق چاندنی کا فرش تھا۔ ایک طرف قالین کی مسند پہ ہارمونیم طبلہ، سارنگی اور ستار اوندھے ترچھے پڑے تھے۔ چھت پہ بڑا سا جھاڑ آویزاں تھا اور آتش دان کے اوپر ربر کے "بتوں" کے علاوہ ایک پرانی وضع کا سبز رنگ کا سنگھاردان رکھا تھا۔

اتنے میں حسن پری کی پاٹ دار آواز بلند ہوئی "حیدن علی —— مجن —— چلو، مہاراج آگئے ——"

میں اور اُمِّ لیلیٰ موکھے میں سر دیئے اس طرح مبہوت ہو کر یہ نظارہ دیکھ رہے تھے جس طرح بچوں کی سیر بین میں ایک کے بعد دوسری رنگ برنگی تصویریں نظر آتی ہیں۔

اب انگلیوں میں بیڑی تھامے ایک بے حد فربہ "مہاراج" کمرے میں

داخل ہوتے۔ دوسرے دروازے سے حسین علی اندر آئے جو میلے سے کپڑے پہنے بجھی بجھی آنکھوں اور بے حد مسکین چہرے والے ایک منحنی سے صاحب تھے۔ وہ فرش پر بیٹھ کر سارنگی کے سر ملانے لگے۔ مہاراج بیڑی گلی میں پھینک کر ہتھوڑی سے بائیں کی ٹھونک پیٹ میں جٹ گئے۔ ایک سترہ اٹھارہ سالہ چھریرا اور خوش شکل سا لڑکا اندر آیا اور ہارمونیم کے سامنے پھسکڑا مار کے بیٹھ گیا۔ پھر حسن پری اسی طرح پیٹی کوٹ اور بلاوز پہنے اندر آئیں اور بڑے تحکمانہ انداز سے کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"یہ ساڑی کیوں نہیں پہنتی ہیں؟" میں نے اُمِّ لیلیٰ سے پوچھا۔ لیکن اسی وقت ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی اندر آئی اور اُمِّ لیلیٰ نے مجھے ٹھوکا دیا۔ "یہ رہی زمرد پری" اس لڑکی نے معمولی سا ریشمی فراک پہن رکھا تھا۔ بال کٹے ہوئے تھے اور سکول کی عام سی طالبہ معلوم ہوتی تھی۔

"یہ حسن پری کی بھتیجی زمرد پری ہے۔ کشمیری محلہ ہائی سکول میں پڑھتی ہے۔" اُمِّ لیلیٰ نے مجھے بتایا۔ اُمِّ لیلیٰ کو سکول میں پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ سکول میں پڑھنے والی لڑکیاں عیسائی اور آوارہ ہو جاتی تھیں۔

میں اندر سبھا کی نوٹنکی دیکھنے کے علاوہ ریڈیو پر اتنی بار اندر سبھا سن چکی تھی۔ کہ مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ لڑکی نے جھک کر پاؤں میں گھنگرو باندھے اور جوں ہی اس کے پاؤں سے چھن کی آواز نکلی، اُمِّ لیلیٰ نے چونک کر میرا ہاتھ کھینچا۔ "جلواب واپس چلیں گھنگروؤں کی آواز کان میں پڑی تو قیامت کے روز فرشتے پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں انڈیلیں گے۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔ بکن حویلی میں شاید ہماری ڈھنڈیا مچ چکی تھی۔ اسی لمحے دو مہریاں ہمارے سر پر آ پہنچیں۔ اور بھیگی بلی بنی امّ لیلیٰ اور اس کے ساتھ ساتھ میں زینے سے نیچے اُتر گئی۔

مارچ ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے۔ لندن میں مکان کی تلاش کے سلسلے میں گریک اسٹریٹ کی اسٹیٹ ایجنسیوں سے بے نیل و مرام واپس آ کر میں اور فیروز سوہو کے ایک چائے خانے میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ چائے۔ چائے خانہ تقریباً سنسان تھا۔ قریب کی ایک میز پر کھچڑی بالوں والی ایک ہندوستانی خاتون ایک چھ سالہ انگریز بچی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ بچی آئس کریم کھا رہی تھی، اور وہ خاتون "ڈیلی ورکر" پڑھنے میں مشغول تھیں۔ شاید وہ میری اور فیروز کی گفتگو دھیان سے سن رہی تھیں۔ کیونکہ چند منٹ بعد اخبار میز پر رکھ کر نہایت شستہ اور کھنک دار لکھنوی لہجے میں انہوں نے ہمیں مخاطب کیا۔

"آپ لوگ —— معاف کیجئے گا —— لکھنؤ کی رہنے والی ہیں؟"

"جی ہاں!" فیروز نے جواب دیا۔

وہ بہت نرمی سے مسکرائیں۔ "لکھنؤ والوں کا ایک دوسرے کو نہ پہچان سکنا ناممکن ہے۔ میرے پاس ایک کمرہ اور غسل خانہ خالی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو کل صبح آ کر دیکھ لیجئے۔ جی ہاں۔ میرا اپنا بورڈنگ ہاؤس ہے۔" انہوں نے مجھ سے کہا۔

ہم لوگوں نے اپنا تعارف کرایا۔ اور انہوں نے اپنا کارڈ ہمیں دیا۔ "مس زیڈ۔ ایچ علی۔" نیچے مکان کا پتہ اور فون نمبر درج تھا۔ مکان بہت دور ٹوٹنگ میں تھا۔

اور مجھے شہر کے اندر فلیٹ درکار تھا۔ لیکن میں نے سوچا۔ جا کر دیکھ لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ خاتون اتنی شائستگی اور خلوص سے باتیں کر رہی تھیں کہ انکار بھی عین بداخلاقی تھی۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ دوسرے دن صبح آؤں گی۔

جب ہم چلنے لگے تو انہوں نے انگریز بچی سے اردو میں کہا۔

"زہرا! آداب کرو ——" بچی نے جھک کر آداب کیا ——

"یہ میری بھتیجی ہے۔" انہوں نے بتایا۔ خدا حافظ کہہ کر میں اور فیروز باہر آگئے۔ مس علی اسی طرح "ڈیلی ورکر" پڑھنے میں مصروف ہو گئیں۔

اتفاق سے اُسی شام مجھے ہیز واٹر میں فلیٹ مل گیا۔ اور میں نے مس علی کو فون پہ اطلاع دے دی۔

میری بات سن کر وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئیں اور پھر بولیں۔

"آپ سے کسی نے میرے متعلق کچھ ذکر کیا ہے؟"

"آپ کے متعلق —— ؟ کیسا ذکر —— ؟ نہیں تو ——"

میں نے تعجب سے کہا۔

"اوہ، اچھا۔ خیر! کوئی بات نہیں۔" انہوں نے اس انداز سے کہا جیسے انہیں میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں کسی روز آکر اُن کے ہاں کھانا کھاؤں۔ مجھے چند روز تک بالکل فرصت نہ تھی۔ لیکن میں نے سوچا، ہو سکتا ہے اُن کا کمرہ نہ لینے کی وجہ سے وہ بُرا مان گئی ہوں۔ اس لئے اُن کے ہاں جانا ضروری ہے۔

اتوار کو تیسرے پہر کے قریب میں ان کے یہاں پہنچی۔ فیروزہ نہ جا سکی۔ اُس کے بچے کی طبیعت خراب تھی۔ مس علی اپنے دو منزلہ کاٹج کے پھاٹک پر ہی میری منتظر تھیں۔ بہت تپاک سے اندر لے گئیں۔ سارے کرایہ دار اتوار منانے کے لیے لندن جا چکے تھے۔ اس لیے کاٹج بالکل خاموش تھا۔ ڈرائنگ روم میں ٹیلیویژن کے سامنے بڑا سا چاندی کا پاندان رکھا تھا۔ آتش دان پر چاندی کے فریم میں ایک بانکے چھبیلے ایکٹر نما شخص کی تصویر لگی تھی، جو پھول دار اسکارف گلے میں لگائے اور چمڑے کی جیکیٹ میں ملبوس، بے حد باریک مونچھیں رکھائے اور ہاتھ میں پائپ سنبھالے بہت ادا سے کیمرے کو گھور رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں تان پورہ رکھا تھا مس علی گلوریاں بناتے ہوئے اپنے کرایہ داروں کے متعلق بتاتی رہیں جو ہندوستانی اور پاکستانی طلباء تھے۔

" زہرا کہاں ہے ؟" میں نے پوچھا۔ سچ یہ ہے کہ مجھے مس علی کا پاندان، تان پورہ، گلوری بنانے کا انداز اور ایکٹر نما شخص کی تصویر، یہ سب کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ اور سمجھ میں یہی آیا کہ یہ بی بی معمولی لینڈ لیڈی نہیں ہیں۔

" اپنی ایک دوست کے یہاں کھیلنے گئی ہوئی ہے۔ رات کو لے آؤں گی"

اس کے بعد انھوں نے ایک بے حد حیرت انگیز بات کی۔ پاندان بند کر کے صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے انھوں نے کہا۔

" آپ نواب اعظم کی بھی رشتہ دار ہیں نا ——— ؟ وہی گوری بی بی کی حویلی والے ——— "

میں بہت حیران ہوئی ——— نواب اعظم ——— گوری دادی۔ سبزی منڈی

کی حویلی ——— اُمِّ لیلیٰ ——— یہ سب عرصہ ہوا میرے ذہن سے محو ہو چکے تھے ———

" جی ہاں !" میں نے کہا ——— " مگر آپ کو کیسے معلوم ؟"

" کیوں آخر میں بھی تو لکھنؤ ہی کی رہنے والی ہوں ۔ ہمارا مکان نواب اعن کے پڑوس میں تھا ——— اُن کے پچھواڑے ——— "

" پرستان منزل ——— ؟ " میرے منہ سے بے اختیار نکلا ۔

" جی ہاں ۔ اور میں زمرد پری ہوں !"

" یا اللہ !! "

" شاید آپ نے مجھے کبھی دیکھا ہو ۔ نواب اعن کی حویلی کی صاحبزادیاں ہمیں اکثر موکھوں میں سے جھانکا کرتی تھیں ۔ کل شام جب آپ نے مجھے فون کیا کہ آپ کو میرے کمرے کی ضرورت نہیں ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ یا تو آپ مجھے پہچان گئی ہیں یا یہاں کسی لکھنؤ والے نے آپ کو میرا کچا چٹھا بتا دیا ہے ۔

" زمرد پری ——— یا اللہ !! " میں نے دریائے حیرت میں غوطہ زن ہو کر دہرایا ۔

" زمرد پری ! جی ہاں ۔ مرزا رسوا نے لکھنؤ کی طوائف کا رومینٹک مرقع کھینچ کر آپ لوگوں کی کتنی نسلوں کو عجیب و غریب خوش فہمیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کر رکھا ہے ۔ "

ایسا تو نہیں ہے ۔ " میں نے ذرا جوش سے جواب دیا ۔ مرزا رسوا کی امراؤ

جان، تو ایک زوال پذیر، کھوکھلے معاشرے کی بڑی ریلسٹک (Realistic) نمائندہ ہے۔

میرے ذہن میں خورشید الاسلام کا مقدمہ گھوم گیا۔ اور ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ واقعی یہ تو حد ہو گئی ہے

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مس علی، یعنی زمرد پری صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر دوہرا رہی تھیں۔
یا اللہ —— یا اللہ —— یعنی حد ہو گئی۔

"آپ کو بھلا یاد ہے۔ آپ نے مجھے کب دیکھا تھا؟ انہوں نے دریافت کیا۔"

"یہ تو اچھی طرح یاد نہیں۔ میں شاید دس گیارہ سال کی تھی۔ اور میں اور کزن اُمِ لیلیٰ ایک دن جھروکے میں سے جھانک رہے تھے۔"

تو آپ —— " میں نے ذرا ہچکچا کر وہ سارا منظر دہرایا جو اب مجھے پوری طرح یاد آ چکا تھا۔

" —— حسن پری میری پھوپھی تھیں۔ حسین علی سارنگی نواز میرے والد اور ہارمونیم والا بچہ میرا اکلوتا بھائی ماجد علی تھا۔ حسن پری کو میں آپا کہتی تھی۔ وہ لاولد تھیں اور انہوں نے مجھے بیٹی بنا لیا تھا۔"

آیئے، کچن میں چلیں۔ آپ کے لئے میں خالص لکھنوی کھانا تیار کرتی جاؤں گی اور آپ کو اپنی داستان بھی سناؤں گی۔"

اور اُس روز، لندن کے اُس دور افتادہ محلے کے ایک خاموش کاٹج کے باورچی خانے میں زمرد پری نے اپنی کہانی سنائی۔

"ہمارا گھرانا ڈیرہ دار طوائفوں کا گھرانا تھا۔ جو شاید نواب آصف الدولہ کے زمانے میں فیض آباد سے لکھنؤ آگیا تھا۔ میری نانیاں پر نانیاں بڑی معرکے کی طوائفیں تھیں۔ میری پر دادی صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ اکثر تذکروں میں اُن کے کلام کا انتخاب شامل ہے۔ ہمارے خاندان کی شاہی دربار تک رسائی تھی۔ میری دادی خدا بخشے، اُس گھرانے کی آخری نامی مغنیہ تھیں۔ بولتے سینما اور ریڈیو کے دور میں ہمارے گھرانے کا وہ شہرہ نہیں رہا۔ لیکن اللہ بخشے دادی کی گائی ہوئی ٹھمریوں کے ریکارڈ آج بھی خاصے کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ حسن پری اور حسین علی اُن کی اولاد تھے۔ حسن پری بھی ماہر گائیکہ تھیں۔ لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا۔ جدید فیشن کے رؤسا پرستان منزل آتے ہوئے جھینپتے تھے اور یوں بھی طوائف کی جگہ —— معاف کیجئے گا —— نئے سماج میں سوسائٹی لیڈیز لے چکی ہیں۔"

حسین علی کی دستور کے مطابق برادری میں شادی کر دی گئی اور مجن اور میں پیدا ہوئے۔ دستور کے مطابق ہی اماں شدید پردے میں رہیں میں ذرا بڑی ہوئی تو آپا یعنی حسن پری نے یہ سوچ کر کہ آج کل گٹ پٹ کرنے والیوں کی قدر ہے مجھے سکول میں داخل کر دیا۔ مجن مجھ سے چار سال بڑا تھا۔ آپا نے اُسے بہت ریاض کرایا۔ لیکن وہ ماہرِ فن "خان صاحب" بننے کی بجائے شہدوں کی صحبت میں پڑ گیا کس بہن بھائی میں محبت نہیں ہوتی۔ میں بھی اپنے بھیا کو بہت چاہتی تھی۔ اور

کوشاں تھی کہ وہ بھی چار حرف پڑھ لے تاکہ اس زندگی سے چھٹکارا حاصل ہو۔ کیونکہ مجھے ہوش سنبھالتے ہی اس ماحول سے کراہت آنے لگی تھی۔

" اس احساس کے ذمہ دار اتفاق سے آپ کی " گوری بی بی کی حویلی " والے تھے۔ عشرۂ محرم میں ایک دن میں اپنے چھجے پر کھڑی تھی، کیا سنتی ہوں کہ نیچے نواب اعزن کی ڈیوڑھی میں کواڑ کے پیچھے سے کوئی لڑکی اپنی مہری کے نیچے سے کہہ رہی۔ " کنچنی کے گھر کا حصہ لے آئے۔ چھی چھی ــــــ آخ تھو ــــــ جاؤ ہاتھ دھو۔ توبہ کرو۔ چھی چھی ــــــ گناہ ہوگا ــــــ "

(یہ ضرور اُم لیلیٰ رہی ہو گی۔ میں نے دل میں کہا)

زمرد پری نے کہانی جاری رکھی ــــــ " یہ سن کر مجھے دھکا سا لگا۔ میں نے اندر آکر آپا سے کہا، " آپا، ہمارے یہاں کا تبرک لے جانے سے گناہ ہوتا ہے؟ ہم لوگ اتنے بُرے ہیں؟ "

آپا اس وقت مسند پر بیٹھی امبا پرشاد جوہری کو میرے لئے جڑاؤ کڑول کا آرڈر دے رہی تھیں۔ میری بات سن کر انہوں نے ابا کو دیکھا۔ وہ مسند کے کنارے اکڑوں بیٹھے تھے اور مجھے حکم دیا کہ میں کبھی حویلی کی طرف والے چھجے پر نہ جایا کروں۔ لیکن مجھے کرید لگ گئی۔ میں نے اندر جا کر اماں سے یہی سوال کیا۔ وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے حسبِ معمول چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ اے لو تو وہ رونے لگیں۔ میں نے ضد کی۔ بتاؤ اماں، ہم لوگوں میں کیا بُرائی ہے؟ بتاؤ بتاؤ ــــــ؟ اماں نے جواب دیا کہ آئندہ میں آپا کے سامنے ایسی باتیں نہ کروں، ورنہ وہ مار ڈالیں گی۔ میں چپکی ہو رہی۔ ذرا سیانی ہونے پر مجھے معلوم

ہوا کہ "طبقۂ ارباب نشاط" کے کیا معنی ہیں۔ لیکن یہ طبقہ کس سماجی اور معاشی نظام کا مرہونِ منت ہے۔ یہ سمجھانے والا مجھے کوئی نہ تھا۔

اب مجھے ناچ گانے کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ آپا جاہتی تھیں، میں ایسی پُرفن مغنیہ اور رقاصہ بنوں کہ "پرستان منزل" اپنی کھوئی ہوئی شہرت دوبارہ حاصل کر لے۔ اب شہر میں ریڈیو سٹیشن بھی کھل چکا تھا اور لکھنؤ کی کئی گانے والیوں نے کلکتہ اور بمبئی جا کر سینما میں بھی نام کما لیا تھا۔ راجہ نواب اور تعلقہ دار ابھی سلامت تھے۔ اور آپا میرے لئے طرح طرح کے خوش آئند منصوبے بنا رہی تھیں۔ لیکن جب میں نے میٹرک پاس کیا تو شور مچا ڈالا "کالج میں پڑھوں گی"۔ آپا نے مجھے بھیگی ہوئی بید سے پیٹا، اور ایک کوٹھڑی میں قید کر دیا۔ اماں دکھیا جلے پاؤں کی بلی کی طرح سارے گھر میں گھومی گھومی پھریں۔ لیکن ابا اور اماں دونوں آپا سے تھر تھر کانپتے تھے۔

"اب اس داستان کو کہاں تک طول دوں بیٹا۔ میں نے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں۔ اب میں پندرہ سال کی ہو چکی تھی اور آپا کے پاس میرے لئے موٹی اسامیوں کی فرمائشیں آنی شروع ہو گئیں تھیں۔ لیکن میرے مولا نے ایک معجزہ کر دکھایا۔

"غم کھاتے کھاتے اور کلستے کلستے مجھے حرارت ٹھہر گئی۔ آپا نے ہڑبڑا کر ڈاکٹروں کو دکھایا تو انھوں نے تپ دق بتائی آپا کے ہوش اُڑ گئے۔ مجھے فوراً بھوالی لے گئیں۔ بھوالی کا بڑا ڈاکٹر ایک بوڑھا بنگالی تھا۔ میرے لئے تو وہ فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔ میں نے اُسے اپنی بپتا سنائی اور اُس نے وعدہ کیا کہ صحت ہو جانے کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ مدت تک وہ مجھے سینی ٹوریم میں رکھے گا ——— تو اس

طرح پدیتا چار برس تک بھوالی میں رہی۔

"وہاں مریضوں میں چند بہت پڑھے لکھے مرد اور عورتیں بھی تھیں۔ اُن مہربان لوگوں نے مجھے کتابیں پڑھنے کے لئے دیں۔ ان کی صحبت میں میرے دل و دماغ کی دنیا ہی بدل گئی۔ میں اب یہی دعا مانگا کرتی کہ ساری عمر یہیں پڑی رہوں، تاکہ پرستان منزل واپس نہ جانا پڑے۔"

"مگر کب تک؟ میں نہ صرف پوری طرح تندرست ہو چکی تھی، بلکہ اتنے عرصے پہاڑ پر بے فکری کی زندگی گزارنے سے رنگ روپ اور زیادہ نکھر گیا تھا۔"

"ایک دن آپا مجھے گھر لے جانے کے لئے آ پہنچیں۔ مجھے دیکھ کر چٹ چٹ بلائیں لیں نظر اتاری، مٹھائی بانٹی۔ بس کھلی جا رہی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ شدید مسرت کس وجہ سے ہے۔ لیکن اب میرے اندر خود اعتمادی آ چکی تھی۔ اور میں نے طے کر لیا تھا کہ اگر آپا مجھ سے اپنے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے کہیں گی تو صاف انکار کر دوں گی۔ اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اب میں کوئی تیرہ برس کی بلّی چھوکری تھوڑی ہی تھی۔"

"میں لکھنؤ واپس آئی۔ پرستان منزل چار سال میں بالکل نہیں بدلی تھی۔ اسی طرح دن کے وقت آپا کے حوالی موالی تاش اور چوسر کی محفلیں جماتے۔ بڑا ز کے پھیرے ہوتے۔ برادری کی طوائفیں اور ڈومنیاں آ کر آپا کی دربار داری کرتیں۔ چراغ جلے تو بہار آ جاتی۔ کھجوری چوٹی میں چنبیلی کا گجرا لپیٹے، سولہ سنگھار کئے آپا تمکنت سے مسند پر بیٹھتیں، ملاقاتیوں کی آمد و رفت شروع ہوتی۔ ابا سارنگی سنبھالے سر جھکائے گانا شروع ہونے کے انتظار میں مستعد بیٹھے رہتے۔

جب اب مجھے اباکی وہ مسکین صورت یاد آتی ہے تو میرا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ابا کو صرف اُسی ایک انداز میں دیکھا۔ بہن کے پیچھے سر جھکائے بیٹھے تند ہی سے سارنگی بجا رہے ہیں۔ چپ چاپ صابر، قانع۔ اُن کے مقدر میں شاید یہی لکھا تھا۔ انہیں تو شاید اس کا احساس کبھی نہ ہوتا ہوگا۔ میں یہی سب سوچ سوچ کر پاگل ہوا کرتی تھی۔

"مجن اب کنکوے بازی کی اسٹیج سے نکل کر جوئے اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں پہنچ چکا تھا۔ سوٹ بوٹ ڈاٹ کر آپا کے ایک ملاقاتی کی موٹر میں اُڑا اُڑا پھرتا تھا۔"

"محرم بھی اسی دھوم سے منایا جاتا۔ آٹھویں تاریخ کو آپا نواب اغن کی مجلس میں نوحہ اور سوز پڑھتیں۔ عشرے کے روز ہمارا اپنا بے حد شاندار تعزیہ نکلتا تھا اور آپا اپنا کہا ہوا نوحہ پڑھتی، سر کے بال کھولے، ننگے پاؤں ماتم کرتی۔ تعزیے کے ساتھ کربلا جاتی تھیں اور انہیں دیکھ کر اس وقت واقعی یہ احساس ہوتا تھا کہ پرانے مٹتے ہوئے لکھنؤ کی تہذیب کی آخری نشانیوں میں سے ہیں

"ایک دن شام کو آپا کے ایک پرانے ملاقاتی کے ساتھ بمبئی کے ایک فلم ڈائرکٹر بھی آئے۔ اور انہوں نے مجھے ہیروئن کے رول کی پیش کش کی۔ میں نے مختصر سا جواب دیا کہ میں فلم اسٹار بننا نہیں چاہتی۔"

"آپا کے ملاقاتی نے بگڑ کر پوچھا تو پھر کیا بننا چاہتی ہو؟ مت بھولو کہ تم کتنا ہی پڑھ لکھ جاؤ، دنیا کی نظروں میں خوش بیری کی لڑکی زمرد ہی رہو گی۔ یہ سن کر غم و غصہ سے میرا رنگ سرخ ہو گیا۔ ڈائرکٹر صاحب بے چارے بھی جھینپ سے گئے۔

ابّا اسی طرح سر جھکائے بیٹھے سارنگی کے سر ملاتے رہے۔ لیکن مجھے بے حد تعجب ہوا کہ آپا نے اپنے دوست ڈائرکٹر صاحب کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی۔ اس کی بجائے وہ چمک کر بولیں "اے ایڑی چوٹی پہ دار دن نگوڑے نلموں کو کیوں لڑکی کو تنگ کر رہے ہو —— خواہی نخواہی —— اُس کا جی اچھا نہیں ہے۔" اور مجھے ابرو کی جنبش سے اشارہ کیا کہ وہاں سے اُٹھ جاؤں۔

"آپا کے رویّے میں واقعی تبدیلی آگئی تھی۔ یہ بھی اصرار نہیں کیا کہ ناچ گانا شروع کر دوں۔ ابّا نے البتہ کہا کہ ریاض کرتی رہو۔ اس لئے میں نے گانا شروع کر دیا اور ریڈیو سٹیشن سے پروگرام بھی دینے لگی۔

"۴۶ء کے آخر کا ذکر ہے۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی ریڈیو پہ خبریں سن رہی تھی کہ آپا اندر آئیں اور محبت سے میرے پاس بیٹھ گئیں۔ آپا پچھلے دو تین ماہ سے بالکل بدل چکی تھیں۔ اس لئے اب مجھے اُن سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ پھر آخر میرے باپ کی بہن تھیں۔ شہزادیوں کی طرح مجھے پالا تھا مجھے بھی اُن سے فطری محبت تو تھی ہی۔ خون کا رشتہ تھا۔ لیکن میں ہی ایسی ناشکری تھی جو اُن کی ایک ایک ادا سے خار کھاتی تھی۔

اس وقت انہوں نے بہت پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ وہ مجھے اعلیٰ تعلیم کے لئے ولایت بھیج رہی ہیں۔

"یقین فرمائیے، مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہ آیا۔ کالج میں پڑھنے کی درخواست پر انہوں نے مجھے بھوکا پیاسا کال کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا اور اب ولایت

بھیجے دے رہی ہیں۔ یا مظہر العجائب!

"دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ انہیں بہت ندامت ہے کہ انہوں نے میری مرضی کے خلاف مجھے اس راستہ پر چلانا چاہا تھا۔ اب وہ خود تائب ہو رہی ہیں اور مجھے اور محسنؔ کو ولایت بھیج کر خود بھائی بھاوج کے ساتھ کربلائے معلیٰ چلی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ تو یہ قبول کرلے پھر انہوں نے کہا، میں سفر کی تیاریاں شروع کر دوں، اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"میں تو خوشی سے دیوانی ہوگئی۔ میں اور محسنؔ ولایت جا رہے ہیں!! محسنؔ پڑھ لکھ کر آدمی بنے گا۔ میں پڑھ لکھ کر شریفانہ زندگی بسر کر سکوں گی۔ یا اللہ، تو نے آپا کی یہ کایا پلٹ کس طرح کر دی۔ یا اللہ، آپا کو اس نیکی کا اجر دے۔ ان کی توبہ قبول فرما میرے مالک!

"میں بیٹا! جھٹ پٹ تیاری میں جٹ گئی۔ لیکن مجھے رخت سفر باندھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیا دیکھتی ہوں جیسے گھر میں بارات آنے والی ہے۔ جوہری اور سنار زیوروں کے ڈبے کھول رہے ہیں۔ غراروں پر کارچوب ہو رہا ہے۔ بنارسی ساڑیاں خریدی جا رہی ہیں۔ میں نے آپا سے کہا اللہ آپا، ولایت جانے کے لئے اس تمام جھام کی کیا ضرورت ہے؟ بولیں، اے بس اب چپ رہ لڑکی! پردیس میں کیا چیتھڑے لگا کر گھومے گی۔ لوگ میرے جنم میں تھوکیں گے، کون کنگلے اماں باوا ہیں۔ جنہوں نے کپڑے لتے کا بھی بندوبست نہ کیا۔ میں مسکرا کر چپ ہوگئی۔ اس اسٹیج پر اختلاف رائے مناسب نہ تھا۔ نہ اُن

بے چاری کو یہ سمجھایا جا سکتا تھا کہ ولایت میں یہ تلواں جوڑے اور کندن کے جھالے کون پہنے گا۔

"اب رہا مجن، تو وہ یوں ہی برف خانے کے چمار کی طرح اکڑا اکڑا پھرتا تھا۔ اب تو بالکل ہی بوکھلا گیا تھا۔ ہونٹ ٹیڑھے کر کے غلط سلط انگریزی سی بولتا۔ دن بھر اپنے چرکٹوں پر رعب گانٹھتا پھرتا۔

"ابا اور اماں کی رنجیدہ صورتیں دیکھ کر میرا دل بیٹھا جاتا۔ ولایت جانے کی ساری خوشی کافور ہو جاتی۔ جانے ان سے کتنے دنوں بعد ملاقات ہو گی۔ اللہ ساتھ خیریت کے سب سے ملاتے۔

"اے لو بیٹیا! پلک جھپکتے میں وہ دن بھی آ گیا، جب آپ نے امام ضامن کی ضامنی میں ہم دونوں بہن بھائی کو پردیس رخصت کیا۔"

"سویرے سویرے ہم لوگ اسٹیشن روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پہ ایک چودھوری پر جیس اور پگڑی والا مونچھیل بھی برابر کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ جب بمبئی پہنچ کر میں اور مجن سرکیشیا جہاز پر چڑھے تو وہ مونچھیل پہلے سے جہاز پہ موجود تھا۔ میں نے ایک آدھ بار مجن سے پوچھا۔ بھیا یہ کون چڑی مار ہمارے ساتھ لگا ہوا ہے؟ مجن نے بے پروائی سے جواب دیا، ہو گا کوئی ہمیں کیا۔"

"جہاز پہ ایک نئی دنیا اور نئی زندگی کی جھلک دیکھ کر میں تو عالمِ حیرت میں تھی۔ کیسی آزاد، بشاش اور مصروف دنیا تھی! برآمدے میں سفید ساڑیوں میں ملبوس چند لڑکیاں ایک طرف کھڑی تھیں۔ میں بڑی خود اعتمادی سے ان کے پاس پہنچی اور پوچھا کہ کیا ولایت پڑھنے جا رہی ہیں؟ بولیں، ہاں، ڈاکٹری پڑھنے جاتے ہیں۔

میں نے خوشی سے کہا، میں بھی پڑھنے جا رہی ہوں۔ ان میں سے ایک لڑکی نے ذرا معنی خیز انداز سے اپنی ساتھی لڑکیوں کو دیکھا۔ پھر وہ سب آگے بڑھ گئیں۔ میں اس وقت اتنی مسرور تھی کہ اُن کے اس رویّہ کا احساس بھی نہ ہوا۔

" جب جہاز نے سائرن بجایا تو ابا مجھ سے لپٹ کر زارو قطار رونے لگے۔ میں بھی خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ مجّن نے ابا کو دلاسا دے کر زینے تک پہنچایا جہاز نے لنگر اُٹھایا اور میں سارے میں سیر کرتی پھری۔ بار پہ ایک توندل راجہ صاحب بھی اپنے مصاحبوں کے ساتھ ڈٹے بیٹھے تھے۔ وہ موچھوں والا مُوا بھی اُن کے برابر میں براجمان تھا۔ پتہ نہیں کیوں، اتنی بار اُس کمبخت کو دیکھ کر مجھے ہول سا آیا۔ ڈنر کے بعد میں اپنے کیبن میں آگئی۔ مجّن دوسری برتھ پہ لیٹا سیٹی بجا رہا تھا۔ اپنی برتھ پہ لیٹ کر دفعتہً ایک خیال آیا۔ میں نے کہا۔ مجّن! ہمارا ولایت میں کون سے کالج میں داخلہ ہوا ہے؟ لندن پہنچ کر ہم کہاں اتریں گے؟ مجھ نگوڑی کو تو یہی خیال تھا۔ کہ میٹرک پاس تو ہوں ہی۔ وہاں جا کر الف اے میں داخلہ ہو جائے گا۔ سب ہو جائے گا ابھی سے کاہے کی فکر کر تی ہو!، اتنا کہہ کر وہ تو کروٹ بدل کر سو گیا۔ پر مجھے دیر تک نیند نہ آئی۔

" دوسرا دن بھی میں نے جہاز کی زندگی اور سمندر کا نظارہ کرنے میں گزارا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کیبن میں گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ مجّن کے علاوہ وہ توندل مہاراجہ صاحب بھی موجود ہیں۔ شراب اُڑ رہی ہے۔ مجّن نے اطمینان سے کہا ــــ آؤ ــــ آؤ ــــ بیٹھو ــــ یہ ہز ہائنس جگ مگ پور ہیں۔ ہمارے ساتھ ہی لندن جا رہے ہیں۔

" میں نے متانت سے ہز ہائنس کو آداب کیا۔ انہوں نے اس طرح مجھے گھور کر دیکھا کہ بس ——— کیا بتاؤں۔ میں لرز کر رہ گئی۔ میں نے اُلٹے پاؤں واپس جانا چاہا لیکن وہ موٹا پِلپِلا دروازے میں راستہ روکے کھڑا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ بذات مہاراجہ کا اے ڈی سی ہے۔ میں نے بجن کو ملتجیانہ نظروں سے دیکھا، لیکن وہ برتھ پہ سے کودا اور جست بھر کے کیبن سے باہر نکل گیا۔

" اس لمحے میری روح کی گہرائیوں سے ایک ایسی گالی نکلی جو اس کے آبائی پیشے کے متعلق تھی۔ کمبخت اصل پہ گیا نا آخر۔ میرا لاڈلا۔ چھینا، ماں جایا بجن ——— میرا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اور میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس عظیم الشان تیرتے ہوئے روشنیوں کے شہر میں، اتھاہ سمندر اور رات کی تنہائی کے بھنور میں اُس خوفناک راجہ کے سامنے بے بس کھڑی تھی۔ اور اُس وقت اپنی حرافہ پھوپھی کی ساری چال بازی میری آنکھوں کے سامنے عیاں ہو گئی۔

" ہز ہائنس وہسکی کا گلاس تھامے بہت اشتیاق سے مجھے گھورے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے نرمی سے کہا ——— دیکھو پری جان! ہلہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے تمہاری پھوپھی کو پندرہ ہزار نقد اور بیس ہزار کے زیور دے کر تمہیں حاصل کیا ہے۔ میں ہر تیسرے سال کسی پری زاد کو لے کر یورپ کی سیر کے لئے جاتا ہوں۔ اب جنگ کی وجہ سے کئی سال سے نہ جا سکا تھا۔ نواب صاحب محمود پور کے ہاں مجرے میں تمہیں دیکھ کر، تم پہ زہر کھایا اور تمہاری انوکھی ہٹ کی داستانیں سن کر طے کر لیا کہ اب کے تمہیں ساتھ نہ لے گیا تو اپنا نام بدل دوں گا! اور تم ہو سچ مچ بھولی۔ اپنی پھوپھی کے بھرّے میں آ گئی۔ ارے ——— ارے۔

روؤ نہیں۔ میں تمہیں اپنی آنکھوں کی پتلی بنا کر رکھوں گا۔ چار مہینے تک یورپ میں رانی بنا کر رکھوں گا —— ارے، تم نے ابھی دنیا دیکھی ہی کیا ہے؟ —— پاگل چھوکری نہیں تو ——،

"تین دن تک میں اپنے کیبن سے باہر نہ نکلی۔ ریلنگ پر سے سمندر میں کود جانا بہت آسان تھا۔ لیکن یا تو مہاراجہ ہر وقت میرے ساتھ لگا رہتا۔ یا وہ موا اے ڈی سی پہرے پر چوکس رہتا رہا مجن تو وہ مزے سے بار پر بیٹھا شراب پینے میں جٹا رہتا"

"آخر ایک دن میں عرشے پر گئی تو وہ طالب علم لڑکیاں مجھے دیکھ کے مسکرانے لگیں۔ سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ کہ میں ہز ہائنس کی محبوبہ ہوں۔ چند روز بعد میں نے اپنی اس بے بسی سے سمجھوتہ کر لیا۔ انسان جب وقت پڑتا ہے تو ہر طرح کے ظلم و ستم، ہر طرح کی مصیبت اور بے عزتی کو برداشت کر لیتا ہے۔"

یورپ پہنچ کر ہم لوگوں نے کئی ماہ سوئیٹزرلینڈ اور فرانس میں گزارے۔ مجن میری خوشامد میں لگا رہتا۔ آخر کو ماں جایا تھا میرا بھی دل پسیج گیا اور اس سے بول چال شروع کر دی۔

"اس دوران میں ہز ہائنس نت نئی یورپین چھوکریوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے رہے۔ لیکن ہر نئے شوق کے بعد واپس میرے پاس ہی تشریف لاتے۔ دراصل وہ بے چارے سچ مچ "جونیئر رانی" کی طرح مجھ سے برتاؤ کرتے تھے اور میں نے بھی "جونیئر رانی" کی حیثیت سے شوشل فرائض انجام دیئے۔ اس طرح مجھے اس مشہور و معروف انٹرنیشنل کیفے سوسائٹی کی غلاظت کا بھی بخوبی اندازہ ہو گیا۔ اس سوسائٹی میں ہالی وڈ کے فلم اسٹار بڑے بڑے ڈیوک اور ڈچز، سابق

تاجدار، ملک النجار بھی شامل تھے۔ مادر مجھے معلوم ہوا کہ یہ ہستان منزل، مختلف صورتوں سے ساری دنیا میں موجود ہے۔ بڑی بڑی شریف زادیوں کے طور طریق دیکھنے کے بعد مجھے اپنے پس منظر سے اب اتنی شرم بھی نہ آتی تھی۔ میں نے خود پر ترس کھانا، اپنے آپ سے نفرت کرنا بھی ترک کردیا۔ بات یہ ہے کہ اب میں ذہنی اور جذباتی طور پر بڑی ہو چکی تھی۔

" اس دوران میں محض مہاراجہ کے مشیر خاص کی حیثیت سے بڑا طرحدار پلے بلوائے (PLAY BOY) بن چکا۔ ہم لوگ لندن کے سوائے میں مقیم تھے کہ ایک شام ہز ہائنس حواس باختہ کمرے میں آئے اور مجھے اطلاع دی کہ فوراً ہندوستان واپس جارہے ہیں۔ ہندوستان آزاد ہو چکا تھا اور سردار پٹیل نے سارے رجواڑوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ریاست جگ مگ پور بھی اوراق ماضی میں شامل ہونے والی تھی۔ ہز ہائنس نے اپنے دیوان کا کیبل میز پہ رکھتے ہوئے مجھ سے کہا کہ اب اُن کے پاس عیش و عشرت کے لئے فاضل دولت نہیں ہے۔ لیکن وہ مجھے میری پھوپھی کے پاس بحفاظت لکھنؤ واپس پہنچا دیں گے۔ سامان پیک کرتے ہوئے میں نے اُن کے زیورات انہیں واپس کرنے چاہے۔ لیکن انہوں نے غم و غصہ سے گرج کر کہا "میں دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا"۔ ریاست ختم ہو گئی۔ لیکن ابھی میری شرافت باقی ہے۔ مجھے بے چارے پر ترس بھی آیا۔ وہ برا آدمی نہیں تھا۔ محض اپنے طبقہ کا نمائندہ تھا۔ میں نے ہز ہائنس سے کہا کہ لکھنؤ واپس جانے کی بجائے یہیں لندن میں رہ کر کچھ پڑھنے کی کوشش کروں گا۔ انہوں نے جواب دیا پاگل ہو۔ خیر — جو تمہاری مرضی۔

" ہز ہائنس ہندوستان واپس چلے گئے۔ مجن نے بھی طے کیا تھا کہ وہ لندن ہی میں رہ کر بزنس کرے گا۔ اس لئے ہم دونوں نے مزویل ہل پہ ایک سستا سا کمرہ لے لیا۔ ان دنوں کرایے بہت سستے تھے۔"

" بیٹا، یہ بہت لمبی داستان ہے۔ پھوپھی نے پہلے تو ان گنت عتاب نامے بھیجے۔ پھر میری طرف سے صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ مجن نے بزنس کرنے کے لئے سارے زیور مجھ سے لے لئے تھے۔ بزنس فیل ہو گئی۔ باقی زیور وہ جوئے میں ہار گیا۔ اب میں بالکل قلاش تھی۔ میں نے نائٹ سکول میں پڑھا اور دن کو فیکٹری میں کام کرتی رہی۔ برتن دھونے کی نوکری کی۔ سبھی طرح کے پاپڑ بیلے۔ مجن نے بار بار سمجھایا کہ میں پھر اپنی پہلی زندگی اپنا لوں۔ کیا کیا بتاؤں —— آیئے، کھانا تیار ہے۔

زمرد پری نے کھانا نکال کر میز پہ چنتے ہوئے پیشانی پہ سے بال ہٹا کر بات جاری رکھی۔ " پھر یہاں ہندوستانی اور پاکستانی آنے لگے کچھ لکھنؤ والے بھی آئے ان میں سے ایک نے مجھے پہچان لیا اور مشہور کر دیا کہ میں لندن میں پیشہ کر رہی ہوں۔ میں پانچ پانچ پونڈ ہفتہ کی نوکری کر کے برتن مانجھ کر اور فرش دھو کے اپنا پیٹ پال رہی تھی اور مونٹیسری کی ٹریننگ ختم کر چکی تھی۔

ایک دن میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی ایک محفل میں مدعو تھی وہاں چند خواتین نے مجھے دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر شروع کی اور جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔

" مجھے دھکا لگا۔ اس رات واپس آ کر میں نے سوچا —— اس شرافت، اس پارسائی، اس محنت کشی سے مجھے کیا فائدہ ہوا؟ یہ معاشرہ مجھے کبھی عزت

نہ دے گا۔ میں یہاں سات سمندر پار بھی اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں مہاراجہ جگ رنگ پور کی سابق داشتہ زمرد بائی آف لکھنؤ ہی رہوں گی۔ میں اس طرح خون پسینہ ایک کر کے اپنی جان کیوں ہلکان کر رہی ہوں؟ کیا جب میں وطن جاؤں گی تو مجھے کسی اسکول میں نوکری مل جائے گی؟ زمرد بی بی کو اسکول ٹیچر بننے کی اجازت ملے گی؟ شاید آپا ہی ٹھیک کہتی تھیں۔ مجن ہی ٹھیک کہتا تھا۔ کوئی شریف آدمی مجھ سے نکاح کرنے کو تیار نہیں۔ کہاں جاؤں ——— ؟ کیا کروں؟ بٹیا، ایک رات میں دیر تک ٹیمز کے کنارے بھی ٹہلا کی۔ پھر سوچا، خودکشی مہمل بات ہے۔ جد و جہد نہ چھوڑنی چاہیئے۔ کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں میں بھی شرکت کی۔ دن کی محنت مزدوری کے بعد رات کو تھکی ہاری اپنے کمرے میں واپس آتی تو اچانک پرستان منزل، کی شاندار خواب گاہ یاد آجاتی، جس کا چھپر کھٹ اب بھی میرا منتظر ہوگا۔ سوچا واپس چلی جاؤں۔ میں تن تنہا تو انقلاب لانے سے رہی اور انقلاب کی ہمت ہے کس میں؟ معاف کرنا بٹیا، میں نے آپ کے ہاں کے بہت سے مشہور انٹلکچوئیل اور انقلابی دیکھے ہیں۔ جو لندن آ آ کر رہا کرتے ہیں۔ مس زمرد علی سے اب بہت سے معقول لوگ واقف ہو چکے ہیں ——— یہ رائتہ لیجئے ——— یہ راٹھے کیسے ہیں؟

"بے حد نفیس!" میں نے جواب دیا۔ اور مجھے یاد آیا کہ دس سال پہلے واقعی میں نے یہاں چند حضرات سے لکھنؤ کی ایک پراسرار خاتون کا ذکر سُنا تھا کہ کبھی کبھی حلقہ اربابِ ذوق کے جلسوں میں آتی تھی۔

"تو میں نے سوچا واپس چلی جاؤں،" مس زمرد علی نے قہوے کے لئے کیتلی

چولہے پر رکھتے ہوئے کہا۔ مگر ابا اور اماں کربلا جا چکے تھے اور وہیں ان کی مٹی عزیز ہو گئی تھی۔ آپا بتاتا ہے میرے "فرار" کی وجہ سے بالکل بجھ کر رہ گئیں۔ شراب کی لت تھی۔ مگر کربلائے معلّیٰ سے واپس آنے کے بعد توبہ کر لی۔ ایک دم شراب چھوڑنے سے صحت بگڑ گئی۔ اُستاد جی نے مجھے خط لکھا تھا کہ پرستان منزل کے زوال کا آخری دور بہت جانکاہ تھا، آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ گھوڑا گاڑی بک گئی۔ مہریاں اور سائیس برطرف ہوئے۔ راگ رنگ کی محفلیں اُٹھ گئیں آپا نے برادری کی دو چھوکریوں کو پال کر ٹریننگ دینی چاہی کہ میری جگہ سنبھال لیں۔ لیکن وہ دونوں ناکارہ نکل گئیں۔ ان میں خاندانی طوائفوں والا وقار اور رکھ رکھاؤ ہی نہ تھا اور آپا چھچھوراپن برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ میرے چلے جانے سے ان کا دل ٹوٹ گیا تھا اور اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ از سر نو بالاخانہ آراستہ کریں۔ ان نوچیوں میں سے ایک مہ لقا نامی تھی۔ اُس موئی مہ لقا کے ایک آشنا نے آپا پر جادو کیا کہ وہ اُسی کا کلمہ بھرنے لگیں اور وہ غارت گر ایسا حرفوں کا بنا نکلا کہ اُس نے رفتہ رفتہ آپا کی ساری جائیداد ٹھکانے لگا دی اور خود مہ لقا کو لے کر بمبئی چلتا بنا۔ آپا کو آخر دنوں میں حلق کا سرطان ہو گیا۔ اُس کے علاج کے لئے پرستان منزل، گروی رکھی۔ خدا امبا پرشاد جوہری کا بھلا کرے — اُستاد جی نے لکھا تھا، بےچارے نے آخر وقت میں بڑی وضعداری سے دیکھ بھال کی۔ لیکن وہ بھی کیا کرتا۔ سرطان جان لیوا مرض ہے۔ دُکھیا بلرام پور ہسپتال میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مریں۔

"تو اب بس لکھنؤ جا کر کیا کرتی؟ یا کہیں بھی جا کر کیا کرتی؟

"جب لاحاصل، بے مقصد محنت کرتے کرتے میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تو میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک گجراتی تاجر کے ساتھ رہنے لگی۔ وہ چلا گیا تو اُس کی جگہ اور آ گیا۔ چند سال اس طرح کٹے تھے کہ پھر ٹی۔ بی کا مرض عود کر آیا۔ ان چند برسوں میں کچھ روپیہ جمع کر لیا تھا۔ اُس سے یہ مکان قسطوں پر خریدا۔ اب بورڈنگ ہاؤس چلاتی ہوں۔"

"مجنّن کا کیا ہوا؟" میں نے دریافت کیا۔

"مجنّن —— " انہوں نے جھنگلیا سے آنسو پونچھے۔ وہ مدتوں سے لندن کی انڈرورلڈ میں رس بس چکا تھا اور اب برمنگھم میں کسی غیر قانونی بزنس میں مصروف تھا۔ وہاں ایک شراب خانے میں چند ویسٹ انڈین غنڈوں سے فوجداری ہوئی۔ اور اسی میں مجنّن کو بھی کسی غنڈے نے چھرا مار کر ختم کر دیا۔ یہ ڈرائنگ روم کے آتش دان پر اُسی جوانا مرگ کی تصویر ہے جو راجہ صاحب جگ تگ پور کی مصاحبت کے زمانے میں اُس نے پیرس میں کھنچوائی تھی۔ میرا بے چارہ بدنصیب بھیا!

"میں یہ کاٹیج خرید چکی تھی کہ اب اُسے بُلا کر اپنے پاس رکھوں گی۔ اُسے سُدھارنے کی کوشش کروں گی۔ طوائف کے یہاں لڑکے کی پیدائش بدنصیبی کی نشانی سمجھی جاتی ہے۔ اُس غریب کی زندگی کا مقصد ہی کیا تھا۔ جب پیدا ہوا تو سب کے چہرے اُتر گئے۔ بڑا ہوا تو بھوبھی کے لئے ہارمونیم بجانے لگا۔ اور بڑا ہوا تو بہن کی دلالی پہ لگ گیا۔ مجنّن بہت ذہین اور پیارا اللہ کا نھا بلیا! یقین کیجئے، اگر اُسے اچھا ماحول میسّر ہوا ہوتا —— " اُن کے منہ سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

"اُس کے مرنے کے بعد میں دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی۔"

"محسن مرحوم کی سناؤنی آئے ہوئے چھ سات مہینے گزرے ہوں گے۔ کہ ایک رات دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہال میں جا کر کواڑ کھولا۔ تو دہلیز پر سرخ اوورکوٹ پہنے بھورے بال والی ایک آوارہ سی انگریز چھوکری گود میں ایک بنڈل سا لئے کھڑی تھی۔ میری اجازت کے بغیر اندر آ گئی۔ بنڈل میز پر رکھ دیا۔ اور بولی" یہ تمہارے بھائی کی اولاد ہے، اسے سنبھالو۔ برمنگھم میں تمہارے بھائی نے مرنے سے دو مہینے پہلے مجھ سے شادی کر لی تھی۔ اب میں دوسری شادی کرنے والی ہوں۔ میرا منگیتر انگریز ہے اور اُس نے انکار کر دیا ہے۔ کہ نگر کی اولاد کو نہیں پالے گا۔ میں اس پر کبھی اپنا حق نہیں جتاؤں گی۔ اطمینان رکھو۔ اتنا کہہ کر وہ لڑکی تو یہ جا وہ جا۔ میں نے بنڈل کھول کر دیکھا، پیاری سی دو ماہ کی بچی پڑی بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے اُسے کلیجے سے لگا کر مولا کا شکر ادا کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے مولا نے میری دعائیں سن کر زندگی کے گھپ اندھیرے میں میرے لئے ایک چراغ جلا دیا۔

" پھر بھی میں نے اُس کی انگریز ماں کی بات پر پورا بھروسہ نہ کرتے ہوئے قانونی لکھا پڑھی کر کے بچی کو متبنٰی کر لیا۔ اُس کا نام زہرہ رکھا۔ اب ماشاءاللہ سات برس کی ہے اور بے حد ذہین!"

" جس طرح میری پھوپھی نے اللہ آمین کر کے مجھے بڑے ارمانوں سے پالا تھا، میں اپنی بھتیجی کی بڑے ارمانوں سے پرورش کر رہی ہوں۔ اُس کی زندگی کس انداز کی ہو گی؟ یہ کس طرح کی دنیا میں بڑی ہو گی؟ دنیا اس کے ساتھ

کیا سلوک کرے گی؟ میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ شاید آپ ہی کچھ بتا سکیں۔ آپ رائٹر ہیں۔ میں آپ کی کتابیں پڑھتی رہی ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ زندگی کے "کیوں؟" اور "کیا" کی آپ کو بڑی جستجو ہے۔ آپ ہی بتایئے!

"پچھلے سال مجھے بیٹھے بیٹھے لکھنؤ یاد آیا۔ ایک ہُوک سی اُٹھی اور میں نے طے کیا کہ مرنے سے پہلے ایک بار وطن کی خاک آنکھوں سے لگا آؤں۔ زہرہ کو بورڈنگ اسکول میں چھوڑا اور ہوائی جہاز سے پہنچی ہندوستان۔ لکھنؤ جا کر ایک شناسا کے یہاں ٹھہری تو باؤلی باؤلی سی پھری ہر چیز نئی۔ ہر صورت اجنبی، سائیکل رکشا کر کے "پرستان منزل" پہنچی۔ ایک چپراسی نے زینے کا دروازہ کھولا۔ میں نے اندر جھانکا۔ آپ کے شاندار کمرے میں عجب چھچھورا پن دکھائی دے رہا تھا۔ ایک بازاری چھوکری کھڑی فلمی ناچ ناچ رہی تھی۔ کچھ دوکاندار اور طالب علم قسم کے لوگ ہو حق مچا رہے تھے۔ میں نے اندر جا کر نئی بائی جی سے کہا کہ میں حُسن پری مرحومہ کی لڑکی ہوں۔ ذرا ایسے ہی مکان کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے آ گئی تھی۔ اُن بے چاری نے بڑی آؤ بھگت کی۔ میں نے سارے کمروں کا چکر لگایا، جھاڑ فانوس، دیوار گیریاں، تخت پوش ہر چیز وہی تھی۔ لیکن ہر طرف خاک سی اُڑ رہی تھی۔ پھر میں نے بالکنی میں جا کر گوری بی بی کی حویلی پر نظر ڈالی جو جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں سنسان کھنڈر ایسی کھڑی تھی۔ نہ جانے سب لوگ کیا ہوئے؟ پھر میں اپنے کمرے میں گئی تو ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ صحن کی کوٹھری دیکھی تو منہ سے ایک ہیخ نکل گئی۔ برآمدے میں وہ چولہا ٹھنڈا پڑا تھا جہاں اماں نے جب سے بیاہ کر آئی تھیں۔ ساری عمر

کھانا پکاتے گزار دی تھی، چپرکھٹ اسی طرح رکھا تھا۔ ایک طاقچہ میں میری رنگین تصویر اسی طرح موجود تھی۔ ابا اماں کے کمرے میں گئی تو ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

"تب میری نظر ایک سنگھار دان پر پڑی، جو ٹوٹا پھوٹا جالوں سے اٹا برآمدے کے ایک کونے میں تخت کے نیچے پڑا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر نکالا۔ اور تخت کے کنارے پر بیٹھ کر اُس کا پٹ کھولا۔ اور اُس کے اندر لگا ہوا آئینہ دیکھنے لگی ——— اور دنیا کے عروج و زوال کی ساری تصویر میرے سامنے پھر گئی۔ یہ سنگھار دان خدا بخشے۔ آپا بتایا کرتی تھیں کہ اُن کی سکڑ نانی کو نواب علی نقی خاں بہادر نے سچے موتیوں سے بھر کر دیا تھا۔ اور میں نے سوچا، اس آئینے میں گزرے ہوئے وقت میں کتنی حسیناؤں نے کیسے کیسے غرور اور ناز کے ساتھ اپنا عکس دیکھا ہوگا۔ ایک حسن فروش عورت کے حسن کی عمر حد سے حد پندرہ برس رکھ لیجئے اور یہ آئینہ ڈیڑھ سو سال پرانا ہے۔ فانی حسن کے کتنے عکس اس کی سطح پر جھلملا کر، ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔ وہ آئینہ دیکھ کر میں جانے کیا کیا سوچا کی۔ میرے سامنے صرف میری صورت تھی ——— کھچڑی بال، جلی ہوئی رنگت، ویران ہونق چہرہ، سونی آنکھیں۔ یہ میرا چہرہ اس آئینہ کی طویل زندگی کا گویا آخری باب تھا ——— سدا رہے نام اللہ کا!

"میں نے سنگھار دان کا پٹ بند کر دیا اور اندر جا کر باجی سے کہا کہ وہ اگر اجازت دیں تو میں اسے نشانی کے طور پر اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اُن عزیب کی سمجھ میں نہ آیا کہ قیمتی سامان چھوڑ کر میں یہ شکستہ سنگھار دان ہی لے جانے

پر کیوں مصر ہوں۔ خیر، میں نے سنگھار دان اٹھا کر "پرستان منزل" کو آخری بار "خدا حافظ" کہا اور نیچے اُتر آئی۔

"چند روز بعد میں لکھنؤ سے بمبئی آئی، جہاں سے سمندری جہاز کے ذریعہ میں واپس لندن جانے والی تھی۔ بمبئی میں ایک معمولی سے ہوٹل میں ٹھہری۔ صبح کو کچھ خریداری کرنے کے لئے بازار گئی۔ جب لوٹی تو دیکھا سنگھار دان غائب ہے۔ اُسے ہوٹل کا کوئی ملازم چرا کر لے گیا۔ سوچتا ہو گا۔ چور بازار میں بیچ کر دس پندرہ روپے کھرے کرے گا۔

"قصہ مختصر، میں لندن واپس آگئی اور یہاں، جیسا کہ آپ نے دیکھا۔ آرام سے کٹ رہی ہے۔ زہرہ کو اُردو قرآن شریف اور نماز سکھا رہی ہوں۔ کرائے دار میری عزت کرتے ہیں۔ ہر طرح سے اللہ کا شکر ہے ——— رہا آبائی پیشہ ——— جی ہاں ——— آپ کی شکل سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ یہ سوال کرنے والی ہیں لیکن مارے اخلاق کے کرنا نہیں چاہتیں۔ تو بیٹیا اُس پیشے سے مجھے ہمیشہ سے دلی نفرت تھی۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ مجبوری نے سب کچھ کرایا ——— نہیں ——— اب مجھے اس کی ضرورت مولانا کی دین ہے۔ عزت سے دو وقت کی روٹی مل رہی ہے۔"

ہم کھانا ختم کر چکے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بجنے والے تھے۔ مس زمرد علی نے کہا "چلئے آپ کو بس اسٹاپ تک پہنچا آؤں۔ آپ نے اتنی دیر میرے پاس بیٹھ کر میری داستان سنی، اس کے لئے ہمیشہ میں آپ کی ممنون رہوں گی۔ آپ کا گودری بی بی کی حویلی سے تعلق ہے۔

اس لئے میں آپ کو یہ سب بتانا چاہتی تھی۔

ہم لوگ کالج سے نکلے۔ سڑک کے موڑ پر بس آکر رکی۔ میں بس میں سوار ہو گئی۔ اور مس زمرد جبین علی سیاہ اوورکوٹ اور سیاہ دستانے پہنے لیمپ کی دھندلی روشنی کے نیچے مارچ کی رات کے کہرے میں کھڑی رہ گئیں۔

اتفاقات کا یہ عجیب و غریب سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ بمبئی کی ایک جہازی عمارت میں جس کے ہر فلیٹ کا کرایہ دو ہزار روپے ماہوار ہے۔ زیادہ تر غیر ملکی جرمن، روسی، امریکن اور انگریز رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک امریکن خاندان سے میری واقفیت ہے۔ ان لوگوں کے یہاں جن کا نام مسٹر اور مسز جان ڈریک ہے۔ جب میں پہلی بار گئی، تو مسز ڈریک نے بڑے اشتیاق سے مجھے وہ نوادر دکھائے جو ہر تازہ وارد امریکن بھاری قیمتوں پر ہندوستان میں خریدتا ہے۔ جنوبی ہند کی مورتیاں، راجستھانی تصویریں، نیپالی مجسمے اور ایسی ہی بہت سی چیزیں۔ مسز ڈریک کے ایک کمرے کے کونے کی میز پر ایک سبز رنگ کا سنگھار دان رکھا دیکھ کر میں ٹھٹھک گئی۔ اسی وضع کا پرانے ہندوستانی نقشن کا ایک آئینہ ہمارے یہاں بھی تھا اور گودام میں پڑا رہتا تھا کیونکہ انگریزی ڈریسنگ ٹیبل کے دور میں اس قدیم طرز کے آرٹسٹک آئینہ کی جگہ کباڑ خانہ ہی مناسب سمجھی گئی تھی۔ لیکن مسز جان ڈریک کے سنگھار دان کو دیکھ کر مجھے اپنے آئینہ کے علاوہ کوئی اور پرانی بات بھی یاد آئی۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بات ہے۔ میں نے مسز ڈریک سے پوچھا کہ یہ سنگھار دان انہیں کہاں سے ہاتھ لگا؟

"چور بازار سے۔" انھوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔" بمبئی کے چور بازار میں بڑے بڑے نوادر مل جاتے ہیں دیکھئے یہ روز ووڈ کی فرنچ اسٹائل المار ی ٹیپو سلطان کے لئے بلسور میں بنائی گئی تھی۔ اور یہ گوا کا مخصوص صوفہ —— سابق ہندوستانی رجواڑوں اور پرانے پارسیلوں کے گھروں سے نکلا ہوا پیریڈ فرنیچر چور بازار میں بے حد سستا مل جاتا ہے۔ یہ کرسی دیکھئے ——"

"مگر یہ سنگھار دان۔ ——" میں نے دہرایا۔

"اس کا تو کمال ہو گیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ یہ پہلے دہلی کے ریڈ فورٹ میں تھا اور شاید اُسے مغل کوئن نورجہاں نے بھی استعمال کیا ہے۔"

"یا اللہ ——!" مسز جان ڈریک کافی بے وقوف خاتون معلوم ہوتی تھیں۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ سنگھار دان مغل کوئن نور جہاں تو خیر ہرگز استعمال نہیں کرتی تھی۔ لیکن یہ ہندوستان کی تاریخ کے ایک خوبصورت اندوہناک اور بڑے سچک باب میں ضرور شامل رہ چکا ہے۔ میں نے اس کا پٹ کھول کر آئینے پر نظر ڈالی۔ اس کے خانوں کو دیکھا۔ اور نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سنگھار دان سلطنت اودھ کے وزیر اعظم علی نقی خاں بہادر نے سچے موتیوں سے بھر کر زمرد بیہ کی سگڑ نانی کو تحفے میں دیا تھا۔

"آئیے کافی پئیں۔ پھر میں آپ کو بتاؤں گی کہ میں نے یہ راجستھانی تصویر کس طرح خریدی جسے رانی جودھا بائی کے ذاتی مصور نے بنایا تھا۔ آپ کو

انڈین ہسٹری سے بہت دلچسپی ہے۔ بتلایئے، یہ لارڈ بدھا کی مورتی ——"

میں نے مسز ڈربک کو بے حد کوفت کے ساتھ دیکھا۔ میں مسز جان ڈربک کو "انڈین ہسٹری کے متعلق آخر کیا بتا سکتی تھی؟"

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار

ھرے رنگ کی طویل، لکثری کوچ، چیک پوسٹ کی بے رونق عمارت کے نیچے منتظر کھڑی تھی۔ سمندری ہوا میں کھجور کے پتے ہلتے تو ان میں سے چھنتی ہوتی سورج کی کرنوں میں اس کی شفاف سطح جھلملا اٹھتی۔ ایک بارک میں سے نکل کر چند وردی پوش کھٹ کھٹ کر کے سڑک پر آئے اور اچک کر ایک ٹرک میں بیٹھ گئے۔ جیٹی کی سمت سے آتے ہوئے گروہ کو دیکھ کر کوچ کا ایکٹر نما ڈرائیور رنگین رومال سے اپنی باریک مونچھیں صاف کرتا ہوا چائے خانے سے لوٹا اور بڑے اہتمام سے سگرٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ سڑک کے دوسری طرف ایک اجاڑ سے رہائشی بلاک کی ایک بالکنی میں دروازہ کھلا اور سیاہ فراک میں ملبوس ایک موٹی عورت نے باہر جھانکا اور اخبار کا بڑا سا پرچہ اپنا کر نیچے پھینک دیا جو ہوا میں آہستہ آہستہ تیرتا ہوا آگے فٹ پاتھ پہ گر پڑا۔

جیٹی کی سیڑھیوں پہ سے یہ سارا منظر، سلو موشن، کی خاموش فلم معلوم

ہو رہا تھا۔

الویرا اونچ پہ سے کود کر نچلی سیڑھی پہ آگئی۔ شارمین آگے آگے چلتے ہوئے کسی بات پہ بچوں کی طرح ہنسی اور دن دھنی اپنی بچی اور دتی کی انگلی پکڑ کر اوپر چڑھنے لگی۔

لمبے ایجنٹ نے بڑے وقار سے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھ کر کوچ کا دروازہ کھولا اور جب وہ سب کے سب اندر داخل ہونے لگے تو بار بار سر خم کر کے اوپر چڑھنے لگی۔

وہ امریکن وضع کے سوٹ میں ملبوس تھا اور آنکھوں پہ اس نے بہت پھیلے ہوئے گوگلز لگا رکھے تھے۔ ان کا موچھوں والا ادھیڑ عمر کا اسسٹنٹ جس کے چہرے پہ چیچک کے داغ تھے اور جو اپنی چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے بہت زندہ دل اور خوش مزاج معلوم ہوتا تھا سب سے آخر میں تقریباً بھد کتے ہوئے آگے اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

الویرا اور شارمین اس سے نچلی سیٹ پہ ٹک گئی تھیں۔ اور دن دھنی اور دتی ان کے برابر دوسری طرف بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر رلئے چودھری سب سے پیچھے جا کر اخبار میں مشغول ہو چکے تھے۔ ٹھاکر موہن سنگھ الویرا کے پیچھے براجمان تھے جب کوچ روانہ ہوئی تو انہوں نے آگے جھک کر کہنا شروع کیا۔ "جب میں ۵۱ء میں یہاں آیا تھا ——"

ٹھاکر موہن سنگھ بات بات پہ سب کو یاد دلاتے رہتے تھے کہ یہ ان کا دوسرا سفر ہے۔ ایک عاقل اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے سیاح کی

حیثیت سے وہ بڑے سرپرستانہ انداز میں اناڑی مسافروں کو اپنے پچھلے بحری سفر کے واقعات سناتے اور مشوروں سے مستفید کرتے۔

الویرا نے دن وحتی کا بیگ جو سیٹ کے نیچے رکھا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اوپر کھینچا۔ اس میں اور دتی کے دو کومکس اور ونسٹن چرچل کی وہ ضخیم تصنیف جو ڈاکٹر رائے چودھری کل سے پڑھ رہے تھے۔ ہٹینگ کی لُون کے ساتھ مٹلنسی ہوتی تھیں۔ مایوس ہو کر الویرا نے چاروں طرف دیکھا۔ موچھوں والا اسسٹنٹ صبح کے الاہرام کا بونگا بنائے ڈرائیور کے شانے کو اس سے کھٹ کھٹا رہا تھا اور لمبے ایجنٹ سے کچھ کہتا جاتا تھا۔ اس نے ایک انگلی میں سونے کی موٹی سی انگوٹھی پہن رکھی تھی جس میں سیاہ پتھر پڑا تھا۔

الویرا نے پیچھے دیکھا۔ مسٹر سنگھ کے برابر بیٹھی ہوئی مسز مک ڈانلڈ ایک زنانہ امریکن رسالہ گود میں بچھا کر آرام سے سگریٹ جلا رہی تھی۔ رسالے کے سنٹر اسپریڈ پر ایک سخت رومینٹک والا امیر وایک پوڈل کٹ بالوں والی ہیروئن کی آنکھوں میں بڑی لجاجت سے جھانک رہا تھا۔ الویرا پیچھے مڑ کر بیٹھ گئی۔ اور سیٹ کی پشت پر بازو رکھ کر مسز ہارڈنگ کے فراک پر چھپے ہوئے مور گننے لگی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ یقیناً انہوں نے یہ کپڑا کھادی گرام ادیوگ سے خریدا ہے۔ پانچ۔ چھ۔ سات۔ "کیا گن رہی ہو۔" مسز مک ڈانلڈ نے سر اُٹھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں ––" الویرا نے بڑے عجز سے مسکرا کر جواب دیا پھر اُس نے اچک کر مسز مک ڈانلڈ کی گود میں بچھے ہوئے زنانہ چمکیلے باتصویر امریکن رسالے

کی کہانی کو الٹی طرف سے پڑھنا شروع کیا۔ جب میں ایک نوجوان لڑکا تھا تو میری ماں نے مجھ سے کہا تھا ڈکی بوائے۔ تم ساری عمر پرچھائیوں کی تلاش کرو گے۔ جب میں یونیورسٹی پہنچا تو شرلی نے مجھ سے کہا تھا۔ ڈک ہنی۔ تم چاند کے تمنائی ہو۔ مجھ سے شرلی نے کہا تھا تم بھٹکے ہو اور ستاروں کے خواب دیکھتے ہو۔ لیکن میں سوچا کیا۔ شاید۔ اس کے بعد اور آگے بڑھ کر کہیں کسی نکڑ پر۔ کسی شہر میں پہنچ کر۔ کسی دروازے سے برآمد ہو کر وہ مل جائے۔ اس وقت تک اپنی آنکھیں انتظار میں بند رکھو، اور زیادہ اکتاہٹ کے ساتھ الوتیرا پھر سیٹ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کوچ میں باتوں کی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ چاروں انگریز مشنری خواتین پاکستانی انجنیئر لاہور کی لیڈی ڈاکٹر جو نئی دلہن تھی اور بہت بھڑکیلا شلوار قمیض کا سوٹ پہنے تھی اس کا منحنی سا شوہر (میں چارٹرڈ اکاونٹنسی پڑھنے جا رہا ہوں جی۔ ایک روز جب الوتیرا نے اس سے جرح کی تھی کہ آپ انگلینڈ کیوں جارہے ہیں تو اس نے بے حد نیازمندی سے مبہم سے لہجہ میں جواب دیا تھا) دونوں دولہا دلہن دس سال لندن رہنے کے ارادے سے مصروف سفر تھے) موٹا خوبصورت انگریز اور اس کی لمبے لمبے دانتوں والی سیاہ فام مدارسی بیوی، کوچ کے آخری سرے تک سارے مانوس سر کھڑکیوں سے ٹکے باہر دیکھ رہے تھے۔ بمبئی سے آئی ہوئی نرگس کی ہم شکل بوتیرہ لڑکی نے جو ہمیشہ بے حد اسمارٹ فراک یا جینز پہنتی تھی نیچے سروں میں۔

Hand down your head Tom dooley

گانا شروع کر دیا تھا۔

کوچ اب سوئز کے شہر سے نکل ریگستان میں داخل ہو چکی تھی۔ افق کے کنارے کنارے دو پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن میں سے ایک کی شکل ایک مہیب ممی کی ایسی تھی۔ جس کا پروفائیل آسمان کی طرف اُٹھا ہوا تھا اور جس کے سیاہ پاؤں جنوب کی سمت پھیلے تھے۔ دفعتاً لمبے ایجنٹ کی آواز نے الویرا کو چونکا دیا۔

"آپ لوگ جب دس سال بعد یہاں آئیں گے اس وقت تک انشاءاللہ ہمارا اسوان ڈیم تیار ہو چکا ہوگا اور قاہرہ تک یہ اسی میل کا صحرا دنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں شامل ہو جائے گا۔"

"انشاءاللہ۔" الویرا نے بے ساختہ دہرایا۔

"ہمارے ایک بادشاہ نے جو ہمارے سب بادشاہوں سے بیہودہ تھا۔ پچھلی صدی میں یہ محل بنوایا تھا۔" ایجنٹ نے جو مسافروں کی طرف رُخ کئے ہاتھ میں مائیکروفون لئے بیٹھا تھا۔ باہر اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا خشک بے رنگ پہاڑیوں کے دامن میں بنی ہوئی ایک بھدی سی عمارت دھوپ میں بڑی طرح چمک رہی تھی۔ ہمارے اس نامعقول بادشاہ نے ایک کسان لڑکی کو یہاں بھیڑیں چراتے دیکھا اور فوراً اُس پہ عاشق ہو گیا۔ اس کے لئے لاکھوں پونڈ کی مالیت کا یہ محل بنوایا گیا جب کہ ہمارے فلاحین ریگستان کی بھوک میں مرا کئے۔ اور ریتلی زہر آلود ہوائیں ان کو اندھا کرتی رہیں۔"

"طٰہٰ حسین ——" الویرا کی زبان سے نکلا۔

مونچھوں والے نے مڑ کر خوشی سے دیکھا۔ "آپ طٰہٰ حسین کو جانتی ہیں

مادموزیل ؟"

" ان کے مضمون پڑھے ہیں۔" اس نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

" پھر وہ حسین چرواہی ملکہ بن کر اس کے محل میں براجی۔" ایجنٹ کہتا رہا۔

نورجی اور جام تماچی ۔ طرح دیبا در شاہ ایران ۔ مارگریٹ اور ٹونی۔

" شہزادی اور فوٹوگرافر کا سنسنی خیز رومان ——— رائل گورنس کی لکھی ہوئی دوسری قسط اس شمارے میں پڑھیے۔" مسز مک ڈانلڈ نے رسالے کا دوسرا ورق الٹا۔

نرگس کی ہم شکل لڑکی نے پچھلے مہینے کا فلم فیئر لیڈی ڈاکٹر وہلن کے حوالے کیا جو بڑے شدید اشتیاق سے اس کی تصاویر دیکھنے لگی۔ نرگس اور سنیل دت۔ مدھوبالا اور کشور کمار۔ دلیپ کمار اور وجینتی مالا۔

اور بینٹ کے رومان ——— آہ افسانوی مشرق اور پر اسرار ہندوستان۔

" میں اتنی خوش نصیب ہوں کہ میں نے تاج محل عین پورے چاند کے نیچے دیکھا۔" نیویارک کی ادھیڑ مجرد خاتون نے اٹلانٹک سٹی کی ادھیڑ مجرد خاتون سے کہا جو انڈین ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ کے شائع کردہ ۱۹۶۱ء میں " ہندوستان آیئے" کے رنگین اور چمک دار با تصویر کتابچوں کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔

اچانک گہرا نیلا سمندر عین آنکھوں کے سامنے لہریں مارنے لگا۔ شفاف۔ ٹھنڈا، نیلگوں پانی، صحرا کی زرد تپتی ہوئی ریت کے مقابل میں اس کی نیلاہٹ اور زیادہ بھلی اور فرحت بخش معلوم ہوئی۔

" ہم لوگ اتنی دور نکل آئے مگر ابھی تک سمندر کے کنارے کنارے

چل رہے ہیں ۔" شارمین نے اظہار خیال کیا ۔ لمبے ایجنٹ نے ریڈیو بٹون کرنا شروع کیا۔

" ام کلثوم کے گانے آرہے ہیں ؟" الویرا نے دریافت کیا۔

" آپ ام کلثوم کو بھی جانتی ہیں ؟" مونچھوں والے اسسٹنٹ نے اسی مسرت کے ساتھ پوچھا " کل شام انھوں نے قاہرہ سے گایا تھا۔"

سمندر اب بہت قریب آگیا ۔ پھر دفعتاً غائب ہوگیا۔

" ہم لوگ اب تک ساحل کے قریب ہیں ؟ قاہرہ کتنی دور ہے ؟" الویرا نے ایجنٹ سے دریافت کیا۔

" یہ سمندر نہیں تھا سراب تھا ۔" ایجنٹ نے اطمینان سے جواب دیا

——— " اوہ ۔ سراب !! " شارمین نے کہا۔

سراب ۔ سراب ۔ سراب ۔

قاہرہ کے باہر ہلیوپولس کی شاندار عمارتیں سورج کی روشنی میں نہارہی تھیں ۔ کوچ شاہ فاروق کے بکھنگم پیلیس کی نقل میں بنوائے محل کے سامنے سے گزر رہی تو لمبے ایجنٹ نے قہقہہ لگایا ۔

" یہ ہمارے بے چارے بادشاہوں کے احساسِ کمتری کی بہترین مثال ہیں "

نیل کی لہروں پہ پاشاؤں کے شکارے ساکت کھڑے تھے ۔ نائیل ہلٹن کی دیواروں پہ قدیم مصری فریسکوز کے چربے بنے ہوتے تھے۔

" کاش ہم نئے مشرقی لوگ تجدید کے جوش میں اپنے ارجنٹاؤں اور اپنے اہراموں کو اس طرح COMMERCIALISE نہ کرتے ۔" شارمین نے

مسٹر سنگھ سے کہا۔ "اب ننٹ راج کے ذکر پر محض بمبئی کے ننٹ راج ہوٹل کا خیال آتا ہے۔"

"تم آخر چاہتی کیا ہو؟" الویرا نے تیوری پر بل ڈال کر اس سے استفسار کیا۔

"میں جب ۵۱ء میں یہاں آیا تھا۔" ٹھاکر موہن سنگھ نے موقعہ غنیمت جان کر کہنا شروع کیا۔

الویرا کو پھر جیوتسنا یاد آگئی۔ جب وہ دونوں تین دن تک قاہرہ کے بازاروں میں گھومتی پھری تھیں اوکسفرڈ سے نکلی ہوئی دو معصوم، اکسائیٹڈ لڑکیاں، جن کے سامنے دنیا میں صرف امیدیں ہی امیدیں تھیں۔ دس سال قبل۔ دس سال میں بچے جوان ہو جاتے ہیں۔ جوان ادھیڑ۔ اور ادھیڑ بوڑھے ہو چکتے ہیں۔ دس سال۔ دس سال۔ دکھلا دیتے لے جا کے تجھے مصر کا بازار۔

وہ اسکندریہ گئی تھیں۔ یونیورسٹی جا کر شہزادی دینا حمید سے ملی تھیں۔ جو کیمبرج میں ان کے ساتھ رہ چکی تھی۔ جیوتسنا اہرام کے اندر نہیں گئی تھی۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔ تنگ جگہوں میں مجھے لگتا ہے جیسے مر رہی ہوں۔ میں مرنا بالکل نہیں چاہتی بھئی۔ اس نے کہا تھا۔ آج جیوتسنا کو خودکشی کئے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔

شام کو چائے پینے کے لئے وہ سب ایک قہوہ خانے میں گئے۔ صحن میں دور دور تک کرسیاں اور میزیں لوگوں سے گھری ہوئی تھیں۔ تینوں لڑکیاں اور ڈاکٹر راتے چودھری اور ان کی بچی لونے کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے

اور سوڈانی ویٹر کا انتظار کرنے لگے۔

دفعتاً اورن دھتی نے کہا۔ "ادھر دیکھو کیا ہو رہا ہے۔"

الویرا اور شار ٓبین نے فوراً مڑ کر دیکھا۔

صحن کے شمالی سرے پر ایک بے حد حسین اٹھارہ انیس سالہ لڑکی سبز رنگ کی فراک میں ملبوس سبز ہیٹ لگائے بہت سے مردوں کے ہجوم میں گھری بیٹھی تھی۔ لمبا ایجنٹ بھی وہیں پہنچا ہوا تھا اور اس کی کرسی کا طواف کر رہا تھا۔

"کس قدر خوبصورت لڑکی ہے۔" اورن دھتی نے کہا۔

"یہ ماڈل ہے یا ٹیلی ویژن ایکٹرس۔" شار ٓبین نے شرلک ہومز کے انداز میں اطلاع دی۔

"لگتا ہے جیسے ووگ کے صفحوں سے نکل کر آ گئی ہے۔" الویرا نے کہا۔

تینوں لڑکیاں حیرت اور دلچسپی سے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ بڑی تمکنت کے ساتھ گویا تخت پر بیٹھی تھی اور اس کے عشاق اس کے سامنے درباریوں کی طرح کھڑے تھے لمبے ایجنٹ سمیت کئی ایک نے جھک جھک کر اسے پیار بھی کیا۔

"مڈل ایسٹ میں بے ہودگی کی انتہا ہے۔ واقعی۔" شار ٓبین نے کہا۔ ڈاکٹر رائے چودھری کی موجودگی کی وجہ سے جھینپتے ہوئے اس نے نظریں دوسری طرف کر لیں اور جلدی سے چائے بنانے لگی۔ سن رسیدہ اور خاموش طبیعت ڈاکٹر رائے چودھری جو اپنی نوجوان بیوی کی سہیلیوں سے بہت کم بات کرتے تھے۔ شفقت سے مسکرائے۔ "میں اس خوشگوار نتیجے پر پہنچا ہوں۔

"کہ ہندوستانی عورتیں کتنی ہی جدید اور آزاد خیال نہ بن جائیں۔ اصلیت میں رہیں گی وہی ہندوستانی عورت!!"

کافی دیر بعد ایجنٹ ان کی طرف آیا۔ وہ لڑکی بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئی۔ اور ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی جس کا آدھا تنا بال روم میں شامل تھا۔ بار پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور مسکرائے۔ جواباً وہ بھی مسکرائی۔ ایک درشت چہرے والی عورت جس نے بے تحاشا نقلی زیور پہنا ہوا تھا۔ تیز تیز قدم رکھتی پاؤڈر روم سے نکلی، ساری میں ملبوس لڑکیوں کو غور سے دیکھا اور کھٹ کھٹ کرتی پہلو کی اندھیری گلی میں اُتر گئی۔

باہر چوڑی سڑک بالکل سنسان تھی وہ تینوں کوچ میں جا کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئیں۔

اس وقت انہوں نے پہلی مرتبہ اس سُرخ بالوں والی عورت کو دیکھا۔ وہ سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ جہاں مونچھوں والا اسسٹنٹ بیٹھا تھا۔ اس نے کتھئی رنگ کے بہت معمولی کپڑے کا کوٹ اور اسکرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ لڑکیوں کو دیکھ کر ایک دفعہ مسکرائی۔ اس نے پپوٹوں پر گہرا سبز رنگ اور پلکوں پر سیاہ روغن لگایا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں بہت بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے سراپا میں سب سے زیادہ ممتاز چیز اس کے بال تھے۔ آگ کی طرح دہکتے ہوئے سُرخ بال اس کی عمر پینتیس سے چالیس سال رہی ہو گی۔ ممکن ہے اس سے کم رہی ہو۔ مگر جس قسم کی زندگی وہ بظاہر گزارتی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ زیادہ عمر رسیدہ معلوم ہو رہی تھی اور اس کے خاصے حسین

چہرے پہ عجیب طرح کی سختی آگئی تھی۔ نوجوانی میں یہ عورت بھی سبز فراک والی ماڈل کی مانند بے انتہا دلکش رہی ہو گی۔

اب سبز فراک والی لڑکی بھی اندر آگئی اور لمبے ایجنٹ کے پاس بیٹھ گئی۔ مونچھوں والا اسسٹنٹ سرخ بالوں والی کے پاس آن بیٹھا۔

کوچ روانہ ہوئی۔ سرخ بالوں والی عورت نے تیز تیز لہجے میں مونچھوں والے سے عربی میں کچھ کہنا شروع کیا۔ مونچھوں والا ہنس ہنس کے جواب دے رہا تھا ـــــ پھر اس نے مڑ کر الویرا اور شارمین سے کہا۔ "یہ میری بیوی ہے" اس پہ عورت اور زیادہ خفا ہوئی اور اس نے مزید عربی بولی۔ الویرا اور شارمین جھینپ گئیں۔

ڈاؤن ٹاؤن قاہرہ میں پہنچ کر وہ سب ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور کے سامنے اُتر گئے۔ اور دن ڈھلتے خریداری کرتی پھریں۔ الویرا اور شارمین پیدل چلتے چلتے نڈھال ہو گئیں۔ سب لوگ تتر بتر ہو چکے تھے۔ کچھ دیر بعد لمبا ایجنٹ باقی لوگوں کی قیادت کرتا ہوا دوسری فٹ پاتھ پر سے آتا نظر آیا۔ ایک ایونیو پہ وہ ان تینوں سے آن ملا۔ سبز فراک والی حسین لڑکی اس کے ہمراہ تھی۔

"یہ کون خاتون ہیں؟" آخر شارمین سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

"اوہ ـــــ یہ؟ ـــــ یہ میری بیوی ہے ـــــ" لمبے ایجنٹ نے حسبِ معمول اطمینان سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

الویرا اگرچہ دوپیش کی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی جا رہی تھی جیسے

ان سارے مناظر، ان سارے چہروں کا عکس ذہن میں محفوظ کر لینا چاہتی ہو۔ شارمین نے اسے مخاطب کیا۔ مگر وہ ایک دوکان کے سامنے ٹھٹھک کر ونڈو شاپنگ میں محو تھی۔

"ارے بھئی اب آگے بڑھ چکو۔ تم تو قدم قدم پہ اس طرح چپک جاتی ہو۔ جیسے یہ چیزیں کبھی دوبارہ دیکھو گی نہیں۔ شارمین نے جھنجھلا کر کہا۔

"کیا معلوم ـــــ یہاں پھر کبھی نہ آنا ہو ـــــ" الویرا نے بے خیالی سے جواب دیا اور دوکان کے شیشے سے ناک چپکاتے اندر رکھی ہوئی سینڈلز کو تکتی رہی۔

"تم نے ایجنٹ کی بات سنی؟" شارمین نے پوچھا۔

"ہاں ـــــ" اس نے چونک کر جواب دیا۔ "خوب! بہت خوب یہاں "کنعان" نہیں کہا جاتا" سیدھی سیدھی بات کہتے ہیں۔ اہلِ مصر کی یہ راست گوئی قابلِ تعریف ہے! پھر وہ دکان کے شیشے سے ہٹ آئی۔

"اسپیڈ کو ـــــ" ڈاکٹر رائے چودھری قریب آکر پائپ منہ سے نکالتے ہوئے مختصراً بولے۔ "ہمیشہ اسپیڈ ہی کہنا چاہیے۔"

اب سورج ڈھل رہا تھا۔ اہرام کے چاروں طرف حدِ نظر تک خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ متوسط طبقے کی شہری سائیکلوں، سکوٹروں اور موٹروں پر لد کر ہوا خوری کے لئے آئے ہوئے تھے۔ یہ چیختے چلاتے جگمگاتے مفرورشہر کے کنارے پر سارے اہرام صبر کے ساتھ چپ چاپ کھڑے تھے اور شہر کی اونچی اونچی جدید عمارتوں کے بعد یکلخت چھوٹے چھوٹے کھلونے ایسے

معلوم ہو رہے تھے۔ یہ بے چاری تکونی عمارتیں سیّاحوں کا لایا ہوا غیر ملکی زرمبادلہ متحدہ عرب جمہوریہ کے خزانے میں بھرنے کے علاوہ قاہرہ کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے مقبول ترین راں دیئے دو ¹ کا فرض بھی انجام دیتی تھیں۔ ان کے علاوہ ان گنت ٹیڈی بوائز اور ٹیڈی گرلز تنگ موری کی پتلون پہنے اور برجی بارود کی طرح بال رکھاتے اہرام کی ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے اس کی چوٹی کی طرف جا رہے تھے یا اوپر سے اُتر رہے تھے۔

"یس آپ کو اندر جانے کی رائے نہ دوں گا۔ اندر بے حد گھٹن ہے اور اوپر تک چڑھنا بڑی ہمت کا کام ہے۔"

"واہ ہم تو ضرور جائیں گے۔" شاریمن نے کہا۔

جیوتسنا نے تیم۔

اہرام کے دروازے پر ایک خشمناک طویل القامت عبا پوش گائیڈ نے انہیں آلیا۔ "گڈ ایوننگ میڈم۔ ای جیبٹ لائیک انڈیا ویری اولڈ کنٹری۔ ویری این شنٹ سوی لائیزیشن۔

کم آن اِن میڈیم۔ کم آن اِن ———" ²

---

¹ RENDEVOUS

²

مسز رک، ڈانلڈ اور دونوں امریکن خواتین بے حد اشتیاق سے گائیڈ کے قریب آگئیں۔ اندر نیم تاریک ڈیوڑھیوں میں ایک جم غفیر موجود تھا۔ غلام گردش میں کچھ دور جا کر شارلین نے گھبرا کے کہا "میرا تو دم گھٹ جائے گا۔ تنگ جگہوں میں لگتا ہے جیسے مر رہی ہوں۔ میں تو مرنا نہیں چاہتی۔ لاحول ولا قوہ ——"

اور وہ اُلٹے پاؤں باہر گئی۔ "ٹھہرو ہم بھی آتے ہیں۔" الویرا نے کہا۔ مگر ہجوم نے پیچھے سے دھکا دے کر اسے آگے بڑھا دیا۔ اس نے با دل ناخواستہ زینہ چڑھنا شروع کیا۔ پتلی پتلی آہنی سیڑھیاں جو ایک سرنگ کی طرح اہرام کی چوٹی کی طرف جاتی تھیں ان کے دونوں جانب لوہے کی ریلنگ تھی۔ نیچے سنگلاخ فرشوں اور چکنے سرمئی سنگلاخ دیواروں والے منزل در منزل اور تہ در تہ تاریک اور نیم تاریک کمرے تھے اور تینوں طرف سے دیواریں اس طرح جھکی آرہی تھیں۔ جیسے ابھی دم گھونٹ دیں گی دیواروں میں برقی روشنی کے ٹیوب لگے تھے ان دیکھے موکھوں میں سے ہوا کی ذرا سی رمق اندر آجاتی تھی۔ چاروں ہاتھوں پیروں پر جھکے (تاکہ سر چھت سے نہ ٹکرائے)، لوگ ہانپتے کانپتے اوپر چڑھ رہے تھے۔ مگر زینہ ختم ہوتے ہی میں نہ آتا تھا۔ آگے اور پیچھے ایک خلقت بھڑ بھڑ وہاں اوپر جانے کے لئے کوشاں تھی یا نیچے اتر رہی تھی۔ الویرا اگر جنگلے سے ذرا کی ذرا اٹک کر سانس لینے کی کوشش کرتی تو ریلا اسے دھکا دے کر پھر آگے بڑھا دیتا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے ایک شدید وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہے۔ جس طرح کا خواب اس نے سوتے میں اکثر دیکھا تھا کہ ایک اندھا کنواں ہے جس میں گرتی جارہی ہے یا قبر میں زندہ دفن کر دی گئی ہے۔

آدھی چڑھائی چڑھ کر اسے بے حد کمزوری محسوس ہوئی اور اس کی ہمت بالکل ٹوٹ گئی۔ اس نے واپس جانا چاہا لیکن انگریز مشنری خواتین جو بڑے جوش و خروش سے اس کے پیچھے پیچھے آرہی تھیں اس سے کہتی رہیں۔ بڑھی چلو جب اتنی دور آگئی ہو تو اب واپس جانا کیسا۔ غالباً یہی ان لوگوں کا فلسفۂ حیات ہے۔ جس کے سہارے یہ زندہ ہیں۔ جب اتنی دور آگئیں تو واپس جانا کیسا۔" الویرا نے پھر لشتم پشتم اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔

بالآخر وہ اوپر "کنگز چیمبر" تک پہنچ گئی۔ لیڈی ڈاکٹر دلہن اور دونوں انجینیر لڑکے گائیڈ سمیت وہاں پہلے سے پہنچ چکے تھے۔ اس سنگی سرمئی دیواروں والے چھوٹے سے کمرے میں جو بڑے سے صندوق کی طرح چاروں طرف سے بند تھا ایک طرف پتھر کا خالی تابوت رکھا تھا۔ کمرے میں ناقابل برداشت حبس تھی۔ گائیڈ نے اپنی داستان شروع کی۔ مگر الویرا حد سے زیادہ وہشت زدہ ہو کر الٹے پاؤں واپس بھاگی۔

دیوار اور سیڑھیوں کے درمیان جو تنگ سی جگہ تھی اس کے کونوں کھدروں میں نوجوان مصری جوڑے اس اطمینان سے ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے تھے۔ گویا یہ لرزہ خیز دم گھوٹنے والا اہرام نہیں تھا۔ لندن انڈر گراؤنڈ کی برقی سیڑھیاں تھیں۔ افتاں و خیزاں غلام گردش تک پہنچ کر الویرا باہر نکلی۔

باہر دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ نیلا آسمان۔ پرندے۔ ہرے بھرے درخت۔ ہوا۔ تازہ ہوا۔ خداوندا۔ ہوا کتنی بڑی نعمت ہے۔

" آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔" اس نے منڈیر پر کھڑے ہوئے ڈاکٹر راتے

چودھری کا بازو پکڑ کر غصے سے کہنا شروع کیا، "کہ میں پانچ ہزار برس کی تاریکی اور دہشت گہرائی اور بُعد اور تنہائی کا سفر طے کر کے آ رہی ہوں۔ اور اہرام مصر انتہائی عظیم الشان فراڈ ہیں۔"

"مگر کیا انجنیئر کا کمال ہے صاحب۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔" دوسری طرف مسٹر موہن سنگھ چھڑی ٹیکے دوستوں کے مجمع سے مخاطب تھے۔ جیسے ہمارے یہاں کے ستوپ۔ میں جب ۵۳ء... ہیں۔"

دھوپ مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ نشار ہین اور درن وھتی مجمع میں غائب تھیں۔ ڈاکٹر رائے چودھری پائپ سلگا کر خاموشی سے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ ٹیلا اتر کر سڑک پر آئی جس کی دوسری جانب لگر نگ آسمان کے مقابل یک لخت ابوالہول نظر آ گیا وہ شفق کی روشنی میں اور زیادہ پُر اسرار اور پُر سکون اور عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی شکستہ مسکراہٹ میں نرمی تھی اور دردمندی۔ اور جسے کیا ہزاروں برس سے وہ دنیا کا اسی طرح نظارہ کر رہا تھا ــــ یا تھی ــــ ویسٹ لینڈ کے ٹائی ریسیس کی مانند۔

آس پاس چھوٹے اہراموں کے چاروں طرف شہر کے اعلیٰ طبقے کے لڑکے۔ اور لڑکیاں شہسواری کے لئے آئے ہوئے تھے۔

رفتہ رفتہ سورج ابوالہول کے پیچھے ریت میں ڈوب گیا اس کے پنجوں کے درمیان لائے کے پھولوں کے ڈھیر پر چھوٹی سی کلوپیٹرا لیٹی ہوئی ہے۔

چاندنی رات[1]

اور پھر جنوب کی سمت سے ایک انسان دبے پاؤں آیا اور اسفنکس کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔

لبیک اسفنکس۔ جولیس سیزر کا سلام قبول کر۔

اس دنیا میں پیدا ہونے کی وجہ سے جن دنیاؤں سے مجھے جلا وطن ہونا پڑا ان کی، اور ایسے انسانوں کی تلاش میں، جیسا میں خود ہوں، میں ملکوں ملکوں گھوما ہوں۔ مجھے ریوڑ اور چراگاہیں، آدمی اور شہر دکھائی دیئے، لیکن کوئی دوسرا سیزر نہ ملا۔ کوئی انسان اپنا جیسا میسر نہ ہوا جو دن کو میرے کارنامے انجام دیتا اور رات کو میرے جیسے خواب دیکھتا۔ سامنے کی چھوٹی سی دنیا میں اسے اسفنکس میرا مرتبہ اتنا ہی بلند ہے جتنا تیرا اس صحرا میں ہے۔ فقط میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ تو ایک جگہ بیٹھی ہے میں فتح کرتا ہوں تو یہ داشت کرتی ہے۔ میں عمل کرتا ہوں اور متحیر رہتا ہوں۔ تو دیکھتی ہے اور منتظر ہے میں اوپر نگاہ اٹھاتا ہوں اور میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ نیچے نظر کرتا ہوں اور اندھیرے میں ڈوب جاتا ہوں۔ چاروں طرف دیکھتا ہوں اور ششدر رہتا ہوں جب کہ تو مسلسل سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھی ہے دنیا سے باہر کھوئی ہوئی دنیاؤں کی طرف۔ اس گہوارے کی سمت جہاں سے

---

[1] برنارڈ شا۔ سیزر اینڈ کلوپیٹرا۔

نکل کر ہم بھٹک گئے۔ اسفنکس تم اور ہیں نسلِ انسانی کے لئے اجنبی ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں۔ کیا مجھے ساری عمر تمہارے وجود کا احساس نہیں رہا؟ رونا ایک دیوانے کا خواب ہے یہ میری حقیقت ہے۔ یہ ستاروں کے ایسے تمہارے چراغ میں نے گال میں، برطانیہ میں، ہسپانیہ میں، تھسلی میں، ہر جگہ دیکھے ہیں۔ یہ چراغ جو تحت الثریٰ میں چھپے ہوتے کسی ابدی نگہبان کو اہم رازوں سے باخبر کرتے ہیں۔ اس ابدی نگہبان کا مقام میں کبھی نہ پا سکا۔ وہ بالآخر یہاں موجود ہے۔ میری زندگی کے مستقل اور زندہ جاوید حصے کا پرتو، خاموش، سوچا ہوا نفرتی صحرا میں تنہا۔ اسفنکس۔ اسفنکس۔ میرا یہاں آنا قسمت میں لکھا تھا۔ کیونکہ میں ہوں جس کی جینس کی تو علامت ہے۔ جو بیک وقت حیوان بھی ہے۔ عورت بھی، اور خدا بھی۔ کیا میں نے تیری پہیلی بوجھ لی ہے اور اسفنکس ——— ؟"

"بڑے میاں۔"

"دیونانو ——— !!"

"بھاگو نہیں بڑے میاں۔"

"بڑے میاں؟ میں جولیس سیزر ہوں۔"

"بڑے میاں۔"

"اسفنکس ——— ! تم اپنی صدیوں کی عمر چھپاتی ہو۔ میں تم سے کہیں چھوٹا ہوں۔ گو تمہاری آواز لڑکیوں کی ایسی ہے۔"

"جلدی سے اوپر آجاؤ۔ ورنہ رومن تمہیں کھا جائیں گے۔"

"تم کون ہو؟"

"کلیو ——"

"ہلو ——" کسی نے پیچھے سے آکر بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا وہ چونک کر پلٹی۔

"اوہ —— مادموزیل مجھے معاف کر دیجئے۔" ایک دلکش سنجیدہ چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں والا مصری نوجوان بے حد گھبرا کے کہہ رہا تھا۔ "میں ـ میں آپ کو اپنی ایک شناسا خاتون سمجھا۔ اللہ۔ براہ کرم میری اس غلط فہمی کو درگزر کیجئے۔"

"کوئی بات نہیں۔!" الوتیرا نے بڑے اخلاق سے جواب دیا "لیکن میں ڈر ضرور گئی۔" اس بے چارے کی ندامت کم کرنے کے لئے اس نے گفتگو جاری رکھی کیونکہ وہ اپنی اس "بدتمیزی" کی وجہ سے بڑی طرح گھبرایا ہوا نظر آرہا تھا "میں سمجھی کہ توت عنخ آمون کی روح نے مجھے آدبوچا —— کیونکہ ابھی ابھی اہرام سے باہر نکل کر میں نے موصوف کی شان میں بہت گستاخی کی تھی۔ اور پتہ نہیں وہ توت عنخ آمون تھے یا کوئی اور ——"

وہ آہستہ سے مسکرایا۔ "ماضی میں سب کے نام ایک سے ہوتے ہیں، ہے نا؟" اس نے پوچھا۔ اور بڑی عجیب بات ہے کہ اس کے لہجے میں کسی پرانے دوست کی سی اپنائیت تھی۔ دنیا کے سارے اجنبی مخلص دوست ہیں۔ بشرطیکہ اگر ہم انہیں جان سکیں" وہ سوچ رہی تھی "جی ہاں" اس نے باآواز بلند جواب دیا "مثال کے طور پر نفرتی تی ہی کو لیجیے۔"

وہ پھر مسکرایا۔ گویا الوتیرا کا مطلب سمجھتا ہو۔

"اور جب انسان مرجاتا ہے تو وہ اور آج سے پانچ ہزار قبل مرے ہوئے لوگ ایک ہوجاتے ہیں۔ ہم جب زندہ ہوتے ہیں۔ محض اس وقت تک ہی نئے اور مختلف اور جدید رہتے ہیں۔ بہت خوفناک خیال ہے۔" الویرا نے ملول آواز میں اظہارِ خیال کیا۔

اس شخص نے اپنا تعارف کرانے کی اجازت چاہی۔ یوسف مراد جیسے کیا۔ جیسے کیا۔ قاہرہ کی ایک یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتا ہے۔ اس کے بعد اگلے چند منٹوں تک انہوں نے پنڈت نہرو، کمال عبدالنصر اور تازہ ترین بین الاقوامی صورت حال پہ تبادلہ خیالات کیا۔ شاید وہ قبطی عیسائی تھا۔ اور بہت انٹلکچوئیل قسم کا اور جوشیلا عرب نیشلسٹ معلوم ہوتا تھا۔

"غالباً آپ کے ساتھی آپ کے متلاشی ہیں مادموزیل ——" سڑک کی دوسری طرف بڑھتے ہوئے اس نے الویرا سے کہا اور دن وتھی اور شاریتی دور سے ان کی طرف آرہی تھیں۔

"جی ہاں —— ہم لوگ انگلستان تک اکٹھے سفر کر رہے ہیں یہ دونوں نوجوان خواتین میرے ساتھ اوکسفرڈ میں پڑھتی تھیں۔ ان میں سے ایک اب لندن میں رہتی ہیں اور دوسری اپنے شوہر کے ساتھ جنوبی امریکہ میں مقیم ہیں۔"

"جنوبی امریکہ —— ؟ وہ تو بہت دور ہے۔ ؟"

"جی ہاں۔ بہت ہی دور ہے واقعی —— مسز رائے چودھری جارج ٹاؤن میں رہتی ہیں۔ برٹش گیانا۔"

"اور آپ —— مادموزیل —— ؟"

بھلا وہ اس بے چارے کو کیا بتاتی کہ وہ اپنی موت کی طرف گامزن ہے۔ اس کے کسی ہم سفر کو اس لرزہ خیز حقیقت کا علم نہیں۔ خداوندا۔ کیا دنیا میں کوئی چیز انسانی زندگی سے زیادہ مہمل ہے؟ کیا یہ خلیق سنجیدہ مصری پروفیسر سوچ سکتا ہے کہ اس وقت وہ حسین خوش شکل، نوجوان، متبسم لڑکی سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ خون کے ایک تقریباً لاعلاج مرض میں مبتلا ہے اور جانتی ہے کہ شاید سال بھر کے اندر ختم ہو جائے گی؟ اور گو یہ صحیح ہے کہ زندگی اور موت دونوں مہمل ہیں۔ مگر وہ جب تک زندہ ہے۔ زندہ انسان کی طرح ہنستے کھیلتے زندگی گزارے گی اور آخری سانس تک اپنی قسمت سے نبرد آزما رہے گی۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ "میں اسٹیٹس جا رہی ہوں۔"

"آپ اب وہاں پڑھتی ہیں؟"

"جی —— جی ہاں ——"

"کس جگہ؟"

اس نے ایک لمحہ سوچ کر جواب دیا "بوسٹن۔"

ہسپتال جس میں وہ داخل ہونے جا رہی تھی بوسٹن میں تھا۔ وہ ہسپتال جس میں سے غالباً وہ زندہ باہر نہیں نکلے گی۔

"میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔" نشاط، بین اور روندھتی ٹہلتی ہوئی قریب آ گئیں۔ ڈاکٹر رائے چودھری سر جھکائے پائپ پیتے اور دتی کی انگلی پکڑے دوسری طرف سے آ رہے تھے۔

تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو مصری نوجوان نے بڑے خلوص سے کہا — "مادام —

مے موزیل ۔۔۔۔ وکتور ۔۔۔۔ آپ سب میرے مکان پہ چلیے اور رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔ میری بیوی آپ سب سے مل کر بہت خوش ہو گی۔ وہ بھی ہندوستان کی بے حد مداح ہے۔"

الویرا نے کچھ بے معنی فقرے دہرا کر معذرت چاہی کہ رات کا کھانا انہیں شاریمین کے ایک عزیز کے یہاں کھانا ہے جو یہاں سفارت خانے میں تعینات ہیں کہ جب وہ پھر کبھی قاہرہ سے گزری تو ان دونوں سے ملنا ہرگز نہیں بھولے گی کہ کبھی انہیں بھی کلکتے آنا چاہیے۔ کیا اس کا دل ڈوب رہا تھا؟ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اس نے پھریری سی لی۔ مسز ٹک ڈانلڈ کے زنانہ رسالے میں اس قسم کی صورت حال تو تفصیل سے بیان کی جاتی ہے۔ جب اسے اس بات کا خیال آیا تو اس کا دل چاہا کہ زور سے چیخے۔ اس کا سانس اب تک تہ و بالا تھا جسے وہ بڑی مشکل سے چھپائے ہوئے تھی۔ غالباً اسے اہرام پہ ہرگز نہ چڑھنا چاہیے تھا مگر وہ زندہ انسانوں کی طرح زندگی گزار رہی ہے۔ اور اس کے علاوہ فرق کیا پڑتا ہے۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے دوستوں کے گروہ کو دیکھا۔ اور ایک عجیب کمینے قسم کے احساس برتری نے اسے بے حد مسرور کیا۔ اسے ان سب لوگوں پہ فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ بے چارے نہیں جانتے کہ ان کی زندگیوں میں آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ مگر وہ جانتی ہے۔ صرف اسے اپنے مستقبل کا علم ہے۔ شاریمین کی آواز پر وہ چونکی۔ جو مصری نوجوان سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ پھر انہوں نے اسے خدا حافظ کہا۔ ڈاکٹر یوسف مراد۔ جیتے گیا جیتے گیا۔ عربی ناموں کا تلفظ کس قدر اڑنگ بڑنگ ہوتا ہے۔ ماہ کنعاں۔ چاہ بابل۔

اور کیا تھا۔ ؟ صبر ایوبؑ کیا گریہ یعقوب کیا اور اس کے بعد۔

عشق کی مجبوریاں پوچھے زلیخا سے کوئی
مصر کے بازار میں یوسفؑ کا سودا کر دیا

خدا حافظ ڈاکٹر مراد۔

BON VOYAGE مادموزیل۔

شارین کے چچازاد بھائی ذوالفقار کے گھر جاتے ہوتے راستے میں انہوں نے جامع محمد علی کی منڈیر سے شہر کا نظارہ کیا۔ پھیلا ہوا خوبصورت عظیم شہر، مغربی افق پر ابھی ہلکی سی سرخی باقی تھی۔ الازہر کی عمارت۔ قبطی کلیساؤں کے برج "نیو کایرو" کے محلات ــــ سنسان، باجبروت، دلآویز مسجد کے حسین ایوانوں کے اندر بیش قیمت قالین بچھے تھے۔ بڑے بڑے جھاڑ فانوسوں میں سے نکلتی ہوئی روشنی محرابوں اور دریچوں کی نازک جالیوں میں سے چھن چھن کے باہر آ رہی تھی۔ مسجد کے احاطے میں سیاحوں کے لئے آمون رع اور رتبہ ایسیس کی مورتیاں بک رہی تھیں۔ اذان کی آواز بلند ہوئی اور قاہرہ کے آسمان کے نیچے شفق رنگ، بسیط فضائیں دیر تک لرزاں رہیں۔ جس طرح شفاف گلابی پانی میں بلوریں سنگریزہ پھینکنے سے لہروں کا دائرہ دور تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔

افطار کا وقت ہو چکا تھا۔ "آج روزہ رکھا ہوتا تو کتنا مزہ آتا۔" شارین نے الویرا سے کہا۔ دونوں ساری سے سر ڈھانپے ننگے پاؤں اسلامی جوش کے بارے صحن میں سب سے آگے آگے چلی جا رہی تھیں۔

"میرے ملک کی مسجدیں اس سے کہیں زیادہ شاندار ہیں۔" پیچھے سے آتی ہوئی اور ان دھتی کسی یوریپین ٹورسٹ سے کہہ رہی تھی۔

"ان بنگالیوں کے شاونزم نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ نثار آپین نے چپکے سے اظہارِ خیال کیا۔

"لیکن ہمارے پاکستان کی مسجدوں کے مقابلے کی انڈیا میں ایک مسجد بھی نہیں۔" انجلینیر نے اور ان دھتی کی بات کاٹی۔ اور ان دھتی جب آگے بڑھ گئی تو انجلینیر نے یوریپین سے کہا ——— "یو سی ——— انڈیا از اے ہندو کنٹری ——— اگر آپ کو مسلم کلچر کی اصل شان و شوکت دیکھنا ہو تو میرے وطن آیئے۔"

"ضرور ——— ضرور ———" یوریپین نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔

ذوالفقار کے زینے پر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ان کے یہاں شام کی دعوت کا انتظام ہو رہا ہے۔ حمیدہ باہر آئی اور چیخ مار کر الویرا سے لپٹ گئی۔

"ہمارا ارادہ تھا کہ تمہارے یہاں بیٹھ کر ذرا سستائیں گے۔ مگر ——— مگر یہاں بھی ہنگامہ بپا ہے۔" الویرا نے کہا۔

"ہمیں آئے دن یا ڈنر دینا پڑتا ہے یا ڈنر کھانا پڑتا ہے۔ اسی کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ اتنی اسنوب نہ بنو ——— ڈاکٹر صاحب آپ کیا پئیں گے ———؟" حمیدہ نے اپنی سفارتی مسکراہٹ سوئچ آن کرتے ہوئے ڈاکٹر رائے چودھری کی طرف مڑ کر دریافت کیا۔

"کیا خوف ناک زندگی ہے تمہاری۔" الویرا نے صوفے پر گر کر اظہارِ خیال کیا۔

کچھ دیر بعد مہمان آنے شروع ہو گئے۔ کھانا شروع ہوا۔

"گیارہ بجے۔" پلیٹ اٹھاتے ہوتے نثار مَیں نے بڑی مصروف سوسائٹی لیڈیز کی سی شکل بنا کر حمیدہ سے کہا۔ "ہمیں شیپرڈز پہنچنا ہے" ذوالفقار لڑکیوں کی طرف آیا۔

"کس واسطے کہ اس وقت ہمیں ملبا ایجنٹ ملے گا — شیپرڈ ہوٹل کے لاؤنج میں اس سے ہمارا اپوائنٹمنٹ ہے۔" الوبرا نے بھی بڑے پُراسرار انداز میں کہا۔

"ہم لوگ ایک نہایت بے ہودہ نائٹ کلب جارہے ہیں"، اور دن ڈھتی نے بڑی خوشی سے اطلاع دی۔

"کیا چیلا پن ہے۔" ذوالفقار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "رات کو یہیں آرام سے سوؤ۔ صبح سویرے تمہیں سوئز پہنچا دیں گے۔ اور اگر جہاز چھوٹ گیا تو اور بھی اچھا ہے پورٹ سعید سے سوار کرا دیں گے۔"

اتنے میں منقش سلائیڈنگ ڈور کا پٹ ایک طرف کو کھسکا اور —— سلمان —— اندر داخل ہوا۔

ارے —— الوبرا متحیر رہ گئی —— مضطرب —— متحیر —— خوف زدہ اب کیا ہوگا —— اب کیا۔

کچھ نہیں ہوگا —— اصل زندگی مہمل ہے —— لایعنی —— اور کس طرح وقت ضائع ہوتا ہے —— اور ہوتا رہے گا —— اگر تم زندہ بھی رہ گئیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

"البیرا ——— شارین ——— اور دن دھتی ——— دیکھو کون آیا ہے ——"

حمیدہ نے اناؤنس کیا۔

وہ تینوں کے سامنے باری باری جھکا۔ تھوڑا سا تھیٹر یکل تھوڑا سا شولرس۔

"ان کو پہچانے ——— ؟ یہ جیوتسنا مرحومہ کے دوست ہیں۔" حمیدہ نے اس سے کہا۔

"آداب۔"

اس سے کیا کہا جائے ——— ؟ اس سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ساری زندگی مہمل ہے۔

"بے چاری جیوتسنا کے متعلق سن کر کے مجھے بے حد صدمہ ہوا۔"

اس نے قریب کے ایک صوفے پر ٹک کر البیرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گہری آواز میں کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کہہ سکتی تھی؟ بہت ممکن ہے اگلے سال ہی، اسی صوفے پر ٹک کے اسی طرح کے لئے اور ڈنر کے دوران میں وہ حمیدہ سے کہہ رہا ہو۔ "بے چاری البیرا کے متعلق سن کر مجھے بے حد صدمہ ہوا ———"

دو چار ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میز کی طرف چلا گیا۔

واپسی میں وہ ذوالفقار اور ڈاکٹر رائے چودھری کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ

پہ بیٹھا۔ اور راستے بھر تینوں آدمی آپس میں باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہے کبھی کبھی شار ین اور حمیدہ بھی گفتگو میں شامل ہو جاتیں۔ الویرا سے اس نے کوئی بات نہ کی۔ گویا اس کی موجودگی ہی سے بے خبر ہو۔

وہ یورپ سے لوٹتے ہوئے دو دن کے فائیل ہلٹن میں ٹھہرا تھا اور صبح سویرے ہی دہلی واپس جا رہا تھا۔ ہوٹل پہ اتر کر اس نے سب کو سرسری سا خدا حافظ کہا اور کوٹ کندھوں پہ جھلاتا سیڑھیاں چڑھ کر اندر چلا گیا۔

لیکن نہیں خواہاں کوئی یاں جنسِ گراں کا۔

سڑک کے دونوں طرف ہرے رنگ کی کوچ شیپرڈز کے سامنے ان کی منتظر کھڑی تھی۔ پارٹی کے سارے افراد کھانا ختم کر کے ہوٹل سے برآمد ہوئے سب سے آخر میں سرخ بالوں والی عورت اپنی جگہ پہ آن کر بیٹھی۔ اور اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وہ خوب اچھی طرح نشے میں تھی۔

"یار مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" الویرا نے چپکے سے کہا۔

"تمہارا وہ کالج کے زمانے والا ایبزرڈ پن نہیں گیا۔" شار ین نے غصے سے کہا حالانکہ وہ خود بھی کافی نروس معلوم ہوتی تھی۔ ایک نشے میں دُھت قاہرہ کی طوائف کے ہمراہ آدھی رات کے وقت سفر ——— کس قدر ایڈونچرس بات ہے۔" اس نے مزید کہا۔

کوچ نیل پہ پہنچی۔

میری پر نانی کی پر نانی سیاہ بلی تھی۔ سفید مقدس بلی کی بچی۔ اور دریائے نیل نے اسے اپنی ساتویں بیوی بنایا۔ اسی لئے میرے بالوں میں اتنی لہریں ہیں۔

اور اسی لئے میں من مانی کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میری رگوں میں نیل کا پانی دوڑ رہا ہے[1]۔

دریا پر سے گزرتے ہوئے اگلی سیٹ پر نیم دراز سرخ بالوں والی عورت کے بال ہوا میں اڑنے لگے اور اس نے ان کی مصنوعی لہروں پہ ہاتھ پھیرا۔

"اب ہم" "الف لیلیٰ" جارہے ہیں۔" لمبے ایجنٹ نے مائیکروفون اٹھا کر اناؤنس کیا۔

"آہا۔ سمیعہ کمال ——؟" الوبرا نے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں سمیعہ کمال" مونچھوں والے اسسٹنٹ نے مڑ کر اسی بشاشت سے جواب دیا۔

ریڈیو پہ "چاچاچا" شروع ہو گیا۔

سلومی —— جہاں وہ ناچی —— رقص میں لیلیٰ رہی —— یحییٰ مر رہے۔ موسیٰ مر رہے —— میں ہلاک جادو تے سامری۔ عزیز مصر نخاس پاشا۔ حذیو۔ ڈوریا شفیق۔ پراسرار۔ عبدالوہاب۔ سراب، سراب۔ سراب۔

عہد نامہ جدید۔ مسیح ناصری جناب مریمؑ کی گود میں ٹھنسے، گدھے پر سوار ہیرڈ کے ظلم سے بچنے کے لئے مصر بھاگے چلے آتے ہیں۔ بیت لحم کا ستارہ ظلم سے بچنے کے لئے لوگ ہیں کہ مستقل اِدھر سے اُدھر بھاگے پھر رہے ہیں۔ اور ملکوں اور شہروں کی سرحدوں کی دیواریں ہیں کہ اونچی ہوتی چلی جارہی

---

[1] برنارڈ شا۔ سیزر اینڈ کلوپیٹرا۔

ہلس۔ یوگی اینڈ دی کوہسار —— یروشلم اور برلین —— فلسطین سے مصر۔ مصر سے اسرائیل —— اسرائیل سے جورڈن۔ مصر کے بازار میں یوسفؑ کا پیڑا کر دیا۔

شاریمن اور دن وقتی سے کہہ رہی تھی ”یہ سلیماں جو ہے تمہارا یہ کس قیامت کا دلکش آدمی ہے —— واہ —— واہ —— طبیعت خوش ہو گئی۔“

دل نہیں آیا قیامت آ گئی —— ایک کافر پہ —— ایک کافر پہ —— مائی نیم جانکی بائی الہ آباد۔

میرا دل۔ میرے دل کا دوزخ جس کے ساتوں طبق ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آتشیں ہیں لیکن کوئی دانتے کبھی آکر ان کی سیر نہ کرے گا —— آرزوئیں۔ اور شکستگیاں۔ خداوندا۔ خداوند تعالیٰ جو بدقسمتوں کو کہیں نہیں ملتا اور صوفیوں کے لئے ہر شے کی انتہا ہے اور ہر شے میں میرا خدا جو میرا گڈریا ہے جو مجھے خاموش پانیوں کے کنارے کنارے لے جاتا ہے جو مجھے گھاس پہ آرام کراتا ہے —— اور گو میں موت کے سائے کی وادی میں چلتا ہوںؔ۔ خدایا۔ مجھ پہ رحم کر۔ خداوندا میں تیرے اسرار سمجھنے سے انکار کرتی ہوں۔ میں تیرے قہر اور تیرے جلال اور تیرے غضب کے آگے ایک ذلیل کتیا کی طرح خاک میں لوٹ رہی ہوں۔ آندھی کے پتے کی طرح لرزاں ہوں سزائے موت کے اس قیدی کی طرح جو جلاد کی دستک کا منتظر بیٹھا ہو خداوندا میں تیرے سامنے حاضر ہوں۔

لہ۔ عہد نامہ قدیم۔ تیئسواں لحن داؤدیؑ

میرا دل۔ جو کالی کا مندر ہے۔ جس میں خلقت اٹا لوٹ گھسی ہوئی ہے جس کے تنگ صحن میں چلاتے ہوئے بکری کے بچوں کا سر کلہاڑی سے جدا کیا جا رہا ہے کالی کی تین سرخ آنکھیں سامنے دیکھ رہی ہیں جدھر جہنم ہے۔ کالی کی مورتی سولہ سو سال سے زمین میں آدھی دفن ہے۔ ہاں۔ اس کے مندر کے فرش پہ کتوں کے پلے لوٹتے پھر رہے ہیں عورتیں بکروں کا سرخ سرخ گوشت کاٹ رہی ہیں ہاں۔ ہاں۔

میرا دل سوناگاچی کی تاریک گلی ہے۔ جس میں میری آرزوئیں، میری تمنائیں، میری حیرتیں پاؤڈر سے پتی ہوئی سستی ساڑیوں میں لپٹی کونوں کھدروں میں، غلیظ دیواروں سے لگی کھڑی ہیں۔ اور آنے والوں کو تک رہی ہیں۔ ہر آرزو یہ سوچتی ہے کہ اب کا آنے والا لکشمی لائے گا اس گلی سے نکال لے جائے گا۔

میرا دل سوناگاچی کی وہ سرخ ساڑھی والی خوبصورت معصوم کمسن لڑکی ہے جو اپنے دروازے کے اندر چپ چاپ بیٹھی مسکراتی ہے۔ جس کے سامنے موٹر رکتی ہے مگر دو منٹ ٹھہر کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

اب سارے دروازے مقفل ہیں۔

گلی تو چاروں اور بند ہوئی۔ میں ہری ملن کیسے جاؤں۔

"ہم نے بھی کیا کیا ایڈونچر کئے ہیں" شاریں مسٹر سنگھ کو بتلا رہی تھی۔ "ایک مرتبہ ہم لوگ کلکتہ میں سوناگاچی دیکھنے گئے۔ اوفوہ یہ کس قدر لرزہ خیز" اس لمحے سے میری عقوبتوں میں اضافہ ہوگا۔ میرا ان دیکھا عقوبت رساں مجھے مرتے دم تک کوڑے مارتا رہے گا۔۔۔۔ خداوندا۔۔۔۔ تو جو رحیم و کریم ہے

تو نے مجھے اس لئے پیدا کیا کہ میں اس طرح زندہ ہوں —— اور اس طرح مروں؟ میری زندگی میں وہ خدائے ذوالجلال تو جانتا ہے کہ بیشتر وقت ایسے آئے ہیں۔ جب میں نے کہا ہے کہ یہ میری زندگی کا بدترین، مشکل ترین، خوف ناک ترین لمحہ ہے —— مگر آج کی رات —— اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا تھا؟ —— اور گو میں موت کے سایوں کی وادی میں چلتی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ میرا پیالہ لبریز ہے۔ میرا خدا میرے دشمنوں کے سامنے میرا سر جھکاتا ہے۔

خوبصورت زرد فراک میں ملبوس زلیخا بائی ماچس والا پچھلی سیٹ پر بیٹھی "ٹام ڈولی" آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہے۔

Hand down your head tom dooley
Hand down your head and cry
Hand down your head tom dooley
Poor boy, you are bound to die.

"الف لیلا" کی نیچی سی اسٹیج کے تین طرف نیم تاریکی میں کرسیاں اور میزیں بچھی تھیں۔ اسٹیج پر آرکیسٹرا والے بہت مغموم شکلیں بنائے بیٹھے تھے۔ رقص شروع ہو چکا تھا۔ ایک دبلی پتلی رقاصہ "بیلی ڈانس" کے باریک لہنگے میں نیم ملبوس اپنی ٹانگیں ہوا میں اچھالنے میں مصروف تھی۔ لڑکیوں نے اسٹیج کے کنارے ایک میز کے گرد بیٹھتے ہوئے بڑے اسٹائل سے قہوہ منگوایا گویا ان کی ساری عمر اسی طرح "بیلی ڈانس" دیکھتے اور قاہرہ کے نائٹ کلبوں میں راتیں گزارتے بسر ہوئی ہے ان کا یہ بچوں کا سا اکسایٹ منٹ دیکھ کر ڈاکٹر رائے چودھری بزرگانہ شفقت سے

مسکراتے رہے۔ ایک کے بعد ایک بہت ساری رقاصاؤں نے آن کر اپنے "فن" کا مظاہرہ کیا۔ ان سب کے پیٹ سفید جالی سے ڈھکے ہوئے تھے یہ سفید جالی اچھا خاصا یونیفارم معلوم ہو رہی تھی۔

"لیکن یہ لوگ اپنے پیٹ نہیں ہلا رہی ہیں" شازمین نے مایوسی سے کہا۔ "بیلی ڈانس میں پیٹ ہی تو ہلاتے ہیں نا ——؟"

"ہم سنا ہے جیسے پریذیڈنٹ ناصر حکم دیئے ہیں۔ ان لوگ اپنا بدن کو پردہ کریں۔ سنے اپنا بدن پہلے جتنا کھلتی چھپاتا تھا اب جیاستی چھپائیں۔ اس لیے نہیں سکتیں۔" اوردن دھتی نے بڑی سنجیدگی سے بنگالی اردو میں جواب دیا۔

"کیا نہیں سکتیں ——؟" شازمین نے دریافت کیا۔

"پیٹ نہیں ہلانے سکتیں۔" اوردن دھتی نے جواب دیا۔

"بے چاریوں کو سخت فرسٹریشن ہوتا ہوگا۔ کہ پیٹ ہی نہیں ہلا سکتیں" الویرا نے کہا۔

"رمضان کے مہینے میں یہ بے ہودگیاں —— لاحول ولا قوۃ ——" شازمین نے غصے سے کہا۔ "اور مشرق وسطیٰ کو اسلام کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں اسلام کہیں اپنی اصلی حالت میں زندہ ہے تو برصغیر میں —— کیا تم سوچ سکتی ہو کہ کوئی ہندوستانی یا پاکستانی رقاصہ اس طرح ناچے گی ——؟" اس نے خطیبانہ انداز میں الویرا سے سوال کیا۔

"نا لیاں۔" الویرا نے کہا۔

"ہونہہ —— لاحول ولا قوۃ ——" شازمین نے غصے سے پہلو بدلا۔

"جب میں یہاں ۱۹۵۱ء میں آیا تھا، تب یہ بیلی ڈانسر لوگ ایک دم شفاف اور مختصر ترین لباس پہنتی تھیں۔ کیا زمانے تھے۔ وہ بھی ——" مسٹر موہن سنگھ آہ بھر کر برابر کی میز پر کسی سے مخاطب تھے۔

اتنے میں قریب کی میز پر کھڑبڑ ہوئی اور چاروں مشنری خواتین اس رقص کی تاب نہ لا کر خفگی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور کرسیوں کے درمیان سے گذرتی پاؤڈر روم کی طرف چلی گئیں۔ وہ شام انہوں نے پاؤڈر روم میں بیٹھ کر انجیل مقدس پڑھنے میں گزاری۔

اس کے بعد دو لڑکیاں اور آئیں جن میں سے ایک چارلس اوّل کی ہم شکل تھی۔ دوسری شکل سے بے حد معصوم، ذہین اور حساس معلوم ہوتی تھی۔

"کسی اچھے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہے بے چاری ——" الوبرا نے بے دھیانی سے اظہارِ خیال کیا۔

"خالص، مڈل کلاس ردِ عمل۔ کیا دقیانوسی جہالت کی باتیں کرتی ہو۔ اچھا خاندان۔ بڑا خاندان۔ یہ سب سرمایہ دارانہ نظام کی برکتیں ہیں بی بی۔ جہاں اس دھڑلے سے عورت کی تجارت کی جاتی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ماسکو میں نائٹ لائف ہوتی ہی نہیں سرے سے ——؟" نثار بین نے کانٹا ہوا میں لہرا کر جواب دیا۔ نثار بین ان لوگوں میں سے تھی جنہیں لفٹ ونگ انٹلکچوئیل کہا جاتا ہے۔

"نسوانی اناٹومی کے اس مسلسل مظاہرے سے" مسز بک ڈانلڈ نے برابر کی کرسی سے جھک کر کہا، "طبیعت خراب ہوگئی۔"

"جب ہی تو میں کہتا ہوں مائی ڈیر کہ تم لوگوں کو ایسی جگہوں پر نہیں آنا چاہیئے۔

تم ہماری تفریح میں بھی خلل انداز ہوتی ہو۔" مسز مک ڈانلڈ نے جواب دیا اور بیٹھی ہوئی آواز میں خود ہی ہنسیں۔

ایک گداز سی پختہ عمر عورت نے "آ کر یا مصطفےٰ۔ یا مصطفےٰ۔" گانا شروع کیا۔ اور ساری رقاصائیں اسٹیج پر لوٹ آئیں اور اس کے ساتھ اس مقبول گیت میں شامل ہو گئیں۔

اب رات کے دو بج رہے تھے۔ تینوں لڑکیاں باہر نکلنے سے پہلے پاوڈر روم میں گئیں تو انھوں نے مشنری خواتین کو صوفوں پہ بے خبر سوتے پایا۔ ادھیڑ عمر کی بدشکل، بے رنگ خواتین جو عینکیں لگاتی تھیں اور تازہ ترین فیشنوں اور عطریات کے استعمال سے بے نیاز تھیں اور مسیحؑ ناصری کی انجیل کا پیغام لے کر ملایا کے جنگلوں اور ہندوستان اور پاکستان کے دور افتادہ علاقوں میں گئی ہوئی تھیں ان میں سے ایک تیس سال سے مرزاپور میں رہتی تھیں۔ ایک نے عمر عزیز کے پچیس سال سیالکوٹ کے ایک گرد آلود قصبے میں گزار دیئے تھے انھوں نے اپنی زندگیوں میں کیا کھویا تھا ——— کیا پایا تھا۔؟ یہ بھی عورتیں تھیں۔ اور وہ چالیس سالہ حزانٹ گلیمرس مغنیہ جو سیاہ جالی کا چمکدار گاؤن پہنے اسٹیج پہ "یا مصطفےٰ آیا مصطفےٰ" گا رہی تھی۔ وہ بھی عورت تھی۔ اس نے کیا کھویا تھا ——— کیا پایا تھا ——— ؟

"مس گررڈن ——— اٹھیئے ———" الویرا نے صوفے کے قریب جا کر غیر شعوری طور پر اپنی پرانی "اسکول گرل آواز" میں احترام اور دردمندی سے کہا "اٹھیئے۔ ہم لوگ واپس چل رہے ہیں۔"

وہ چاروں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔ مس کہ رڈن نے آنکھیں چندھی کر کے چاروں طرف۔ گلابی اور نقرئی ساٹن کی دیواروں والے پاؤڈر روم پر نظر ڈالی اور انہیں یاد آگیا کہ وہ کہاں ہیں عینک ناک پر جمانے سے پہلے آنکھیں ملتے ہوئے ایسا لگا جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہی ہوں۔ میں یہاں کیا کر رہی ہوں ـــــ؟

وہ سب باہر نکل آئے۔ رات خنک تھی۔ اندر رقص اسی طرح سے جاری تھا۔ یہ کمال عبد الناصر کے حسین دار السلطنت کا سب سے بڑا نائٹ کلب تھا۔ اور مشرقِ وسطیٰ اور بحیرہ روم کے ساحلوں کی حسین ترین رقاصائیں یہاں ناچتی تھیں۔ پارٹی کے سارے افراد تھکے ہارے سڑک پر آکر کوچ میں سوار ہوئے۔ سُرخ بالوں والی عورت پہلے سے آن بیٹھی تھی۔ اتنی دیر بعد اسے دیکھ کر بڑی عجیب سی یگانگت محسوس ہوئی۔ گویا وہ پرانی دوست ہو۔ ان نیم عریاں رقاصاؤں کے مقابلے میں تو وہ اچھی خاصی مولون معلوم ہو رہی تھی اس نے دروازہ زور سے بند کر کے الوِیرا کو دیکھا اور قہقہہ لگایا۔ الوِیرا سہم گئی۔ کوچ روانہ ہوئی۔

اب سڑکیں خاموش تھیں۔ بازار سنسان ہو چکے تھے۔ جدید قاہرہ۔ پرانا شہر غربا کے محلے۔ کوچ نے بڑی سلامت سے آبادی چھوڑ کر صحرا کا رُخ کیا۔ صبح کا تین بج رہا تھا۔ سویز اسی میل دور تھا لوگ سونے کے خیال سے سیٹوں پر نیم دراز ہو گئے۔ سناٹا چھا گیا۔ لمبا ایجنٹ ڈرائیور کے نزدیک فرش پر بیٹھ گیا۔ سُرخ بالوں والی عورت آگے کو جھک گئی۔ اور اس کے منہ کے قریب منہ لے جا کر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ وہ غالباً بہت تفصیل سے اُسے کچھ بتا رہی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک اسی طرح جھکی وہ لمبے ایجنٹ سے سرگوشی میں مصروف رہی۔ اس کے بعد سیٹ

سے ٹک کر بیٹھ گئی۔

پھر یک لخت اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ دیر تک اسی طرح رویا کی لمبا ایجنٹ اور موچھوں والا اسسٹنٹ اطمینان سے بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ پھر اس نے بھی ایک سگریٹ جلایا اور آنسو پونچھے۔ اور سر پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔

سب لوگ سو چکے تھے۔ کوچ صحرا کے ٹھنڈے سناٹے میں بے آواز خیال کی طرح گزر رہی تھی۔ چاروں طرف وسعت اور تاریکی اور ریت کے ذرے تھے۔ کول تار کی سیدھی سڑک پر سے گزرتی ہوئی روشن کوچ کے اندر مختلف قومیتوں اور رنگوں اور مذہبوں کے مختلف دنیاؤں سے آتے ہوئے اور مختلف دنیاؤں کی سمت جانے والے تنیس مرد اور عورتیں، کمبلوں میں لپٹے آنکھیں بند کئے یا سو رہے تھے یا غنودگی کے عالم میں جہاز پر واپسی کا انتظار کر رہے تھے اور صبح کا، اور بریکفاسٹ کے سُریلے باجے کا، اور روشن سمندر اور اپنے ہم سفروں اور عزیزوں کے مانوس چہروں کا، جو دوبارہ ان کا احاطہ کر لیں گے۔ وہ سب اس وقت سے کچھ پہلے کھو گئے تھے اجنبی شہر، آسیب زدہ صحرا اور رات اور تکان اور نیم خوابی کا یہ سحر بہت مختصر تھا۔ ابھی یہ لوٹ جائے گا۔

سحر لوٹ گیا۔ سویز کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ دور سے اپنا جہاز دکھائی دیا۔ جسے دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی گویا وہ اپنا گھر تھا۔ نیچے اتر کر وہ اپنے پاسپورٹ لینے کے لئے چیک پوسٹ کی طرف بڑھے۔ کوچ خالی ہو گئی۔ سُرخ بالوں والی عورت سب سے پہلے اتر کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔

کسی نے اس کو خدا حافظ نہیں کہا۔ اس نے کسی کو خدا حافظ نہیں کہا۔

وہ کسی کو دیکھ کر مسکرائی بھی نہیں۔ الویرا اپنا بیگ سنبھال کر جیٹی کی طرف جانے لگی تو اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر فرنچ میں کہا "مادموزیل۔ آپ نے ایک پیکٹ گرا دیا۔"

"شکریہ — بہت بہت شکریہ —" الویرا نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے گھبرا کر کہا۔

جواباً اس نے سر ذرا خم کیا۔ گویا وہ مصر کی ملکہ تھی۔ مقدس دریا کی بیٹی۔ جس کی رگوں میں نیل کا پانی دوڑ رہا تھا۔ مصر کی پر اسرار راتوں کی، اداس، روتی ہوئی آنکھوں والی ملکہ — جو اپنے شاہی وقار اور تمکنت کے ساتھ باہر کی دنیا سے آئی ہوئی ایک اجنبی، حیرت زدہ — معصوم، بے وقوف، سانولی لڑکی کا شکریہ قبول کرتی ہو۔

وہ انجن کے پاس اسی طرح کھڑی رہی۔ کہرے میں اس کے سگریٹ لائیٹر کی لو ایک سیکنڈ کے لئے چمکی۔

مسافر سیڑھیاں اتر کر لانچ میں جا بیٹھے۔ وہ کوچ کے پاس کھڑی رہ گئی۔ وہ اور اس کے دونوں ساتھی۔ لمبا ایجنٹ جو ہر ہفتے صبح و شام اسی طرح جہازوں پر آکر غیر دلچسپ، دولت مند، احمق، سیانے، عقلمند، قنوطی، بے تکے، بھانت بھانت کے سیاحوں کو ایک ہی انداز، ایک ہی الفاظ، ایک ہی تعارف کے ساتھ اپنے شہر کی سیر کراتا ہے۔ جس کی خوبصورت اور کمسن بیوی شہر میں ایک عالی مقام طوائف ہے جسے وہ مذاقاً بیوی کہتا ہے۔ مونچھوں والا اسسٹنٹ، سرخ بالوں والی

عورت وہ تینوں اسی میل کا صحرائی فاصلہ طے کر کے قاہرہ واپس جائیں گے۔ کس قسم کا گھر، کس قسم کی صبحیں، کس قسم کی زندگیاں ان کی منتظر ہوں گی۔

کیونکہ اب پو پھٹ رہی تھی۔ سمندری ہوا بہت سرد تھی۔ جہازوں اور کشتیوں کی روشنیاں مدہم پڑ گئی تھیں۔ لڑکیوں کا جہاز دور کھلے سمندر میں ایک باوقار مضبوط مہیب چٹان کی مانند کھڑا تھا۔ اس پر لہراتے ہوئے یونین جیک نے الویرا کو یقین دلانا چاہا کہ دنیا میں ابھی پائیداری باقی ہے۔ سویز کے باوجود۔

تار پر چلنے والی

ہمارے اڈیٹر صاحب پچھلے اتوار کو پیرس سے لوٹے تھے اور اس اتوار کو ایک اور اہم کانفرنس کے لئے ہمارے اخبار کی نئی اور خوبصورت فیشن ایڈیٹر مس سروجنی گپتا کے ہمراہ نیویارک جانے والے تھے۔ میں ہفتے کی سہ پہر کو مس گپتا کے پی فارم کے کاغذات لے کر ایڈیٹر صاحب کے دفتر میں گیا۔ تو وہ عینک ماتھے پر کھسکا کر بولے "میاں صاحبزادے، اگلے سنڈے ایڈیشن کے لئے ایک کالم کا مسالا تیار کرو —— کوئی کلچرل موضوع، کچھ انٹلکچول۔ جاؤ بھاگو، شاباش!"

ایڈیٹر صاحب بے حد شگفتہ مزاج اور نیک دل انسان ہیں۔ انسان جب زندگی میں ہر لحاظ سے مسرور اور کامیاب ہو تو لامحالہ بشاش اور نیک دل بھی ہو جاتا ہے۔ ایڈیٹر صاحب میرا آورش ہیں اور میں کوشاں ہوں کہ ایک روز ان کا جیسا کامیاب انسان کہلاؤں۔

میں ایک "کب رپورٹر" ہوں۔ دو سال پہلے جب تعلیم ختم کی۔ تو ایڈیٹر

صاحب نے جو آبا میاں کے گہرے دوست ہیں۔ صحافت کی طرف میرا رجحان دیکھ کر مجھے اپنے اخبار میں رکھ لیا۔ ان کا اخبار ملک کے بڑے انگریزی روزناموں میں شمار ہوتا ہے۔ لہذا میں اپنی خوش نصیبی پر پھولا نہیں سماتا۔ ایڈیٹر صاحب میرے کام سے بہت خوش ہیں۔ اس وقت ان کے کمرے سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوتے میں نے سوچا کہ ایسی ٹوپ اسٹوری لانی چاہیئے کہ ایڈیٹر صاحب پر میری صلاحیت کی دھاک بیٹھ جائے۔

میں بس میں سوار ہو گیا۔ شہر سے نکل کر مضافات کی طرف بڑھتے ہوئے جب "فریڈم پارک" کے سامنے سے بس گزرنے لگی تو میری نظر سرکس کے تنبو پر پڑی۔ جہاں کل اتوار کو شام سے تماشہ شروع ہونے والا تھا۔

مجھے بے اختیار سوجھی کہ کیوں نہ سرکس پر اسٹوری ہو جائے۔ روس کو دیکھئے کہ وہاں سرکس آرٹسٹ کی ادیب شاعر، بیلے ڈانسر اور دوسرے فن کاروں جیسی عزت کی جاتی ہے۔ نہیں صاحب میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔ مگر آپ ہی بتایئے آپ نے آج تک کسی ہندوستانی سرکس کا نام سُنا ہے؟ کسی سرکس آرٹسٹ کو پدم شری سے نوازا گیا؟ بازی گری کی اس قدیم جنم بھومی میں آج ان فن کاروں کی ذرا بھی قدر اور اہمیت نہیں۔

بس چوراہے پر رکی تو میں اُتر کر فوراً تنبو کی طرف لپکا اور دربان کو پریس کارڈ دکھا کر کہا کہ میں سرکس کے مالک، اور منیجر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس نے بے پرواہی سے کہا "کل آنا" میری نظر سامنے پڑی۔ اندر پارک میں بڑی گہما گہمی تھی۔ پنڈال میں کرسیاں اور اسٹینڈ لگائے جا رہے تھے۔ کارواں کاروں کی قطار

کھڑی تھی۔ شیروں کے پنجروں کے نزدیک ہاتھی جھوم رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر چھولداریاں لگی تھیں۔ میں نے دربان سے خوشامد بھرے لہجے میں کہا، "بھلے آدمی، میں اخبار کا رپورٹر ہوں . . . اور . . . . ."

"کل آؤ۔" اس نے نادرشاہی انداز میں کہا اور بیڑی پھینک کر پھاٹک بند کر دیا۔ میں کھول کر رہ گیا۔ قوم اسی وجہ سے ترقی نہیں کرتی۔ سب اپنی جگہ تانا شاہ بنے بیٹھے ہیں۔ میں نے جھنجھلا کر دوسری بس پکڑی اور گھر روانہ ہو گیا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ میں صبح ہی کو پھر "فریڈم پارک" جا پہنچا۔ بڑی مشکل سے مالک یعنی سیٹھ جی تک رسائی ہوئی۔ دیوزاد سیٹھ جی اپنے خیمے کے سامنے کرسی بچھائے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ جیسے رات کو دیر تک جاگتے رہے ہوں موصوف خاصے ہیبت ناک تھے۔ میں قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک مدراسی لڑکی نے خیمے سے نکل کر چائے سیٹھ صاحب کو پیش کی۔ میں نے کہا، "آپ کے آرٹسٹوں کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔"

"سرکس کا جانا ختم ہوا ——" سیٹھ نے بیزاری سے کہا۔ "کھر چہ ڈبل اور آمدنی بیرو" —— "کیا کرو گے انٹرویو، پھنٹرولو؟"

میں مُصر رہا تو انھوں نے آواز دی، "سید صاحب!"

ایک کارواں کار کے پیچھے سے ایک دُبلے پتلے صاحب برآمد ہوئے۔ سیٹھ نے اُن سے کہا، "آپ کو مس لارا بہار سب سے ملا لاؤ۔" یہ کہہ کر سیٹھ پھر اونگھنے لگے۔

سید صاحب مسکرا کر میرے پاس آئے۔ میں کرسی سے اُٹھا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

"مس لارا کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ٹرک سائیکلسٹ، ٹائیٹ روپ ڈانسر اور افسانہ نگار۔"

"افسانہ نگار؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"افسانہ نگار، شاعر، سبھی کچھ ہیں۔ بڑی خوبیوں کی بی بی ہیں۔ بے چاری، خود کو قوم کی فرانسیسی بتاتی ہیں۔ مگر پہلے آپ اوانگا سے مل لیجئے۔ مس لارا، ابھی سو رہی ہوں گی۔ شہزادی ہیں سرکس کی۔"

یہ سیّد صاحب بھی دلچسپ آدمی معلوم ہوتے تھے۔ واقعی سرکس بڑی عجیب و غریب دنیا نکلی۔

"میں پہلے ہندوستانی فن کاروں کو ملنا چاہوں گا۔"

"بہت خوب!" سیّد صاحب نے کہا اور مجھے ٹین کے عارضی کمروں کی ایک قطار کی طرف لے گئے۔ یہ فاقہ مست مزدوروں کی بستی معلوم ہو رہی تھی۔ جہاں عام، گھریلو، ستر میلی، خستہ حال لڑکیاں پکانے ریندھنے، کپڑے دھونے اور بچّے کھلانے میں مصروف تھیں۔ ان کے گھر والے ادھر ادھر بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔

"لیکن ہندوستانی فن کار ——" میں نے پوچھا۔

"یہی ہیں!" سیّد صاحب نے اطمینان سے کہا۔ "رادھا، شانتا، کملا، پدما، ادھر آؤ!"

چند لڑکیاں شرماتی لجاتی اپنے اپنے کام چھوڑ کر ایک طرف کو کھڑی ہو گئیں۔

"یہ شیر کے پنجرے میں جاتی ہیں۔ تار پہ چلتی ہیں۔ آگ میں کودتی ہیں۔ ان کو معمولی مت سمجھیے جناب والا۔" سیّد صاحب نے دفعتاً زیادہ اداسی سے کہا۔

"مگر یہ آپ کو کوئی انٹرویو نہیں دے سکیں گی۔ یہ صرف ملیالم جانتی ہیں۔ اور ان پڑھ ہیں۔ کیرالا کے افلاس زدہ دیہات میں ان کے فاقہ کش والدین چھ چھ سات سات برس کی عمروں میں ان کو سرکس والوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔"

"کیرالا میں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں! وہاں سرکس کی روایت بہت پرانی ہے۔ یہ لڑکیاں سرکس میں کام کر کے والدین کی کفالت کرتی ہیں۔ کوئی انشورنس سوشل سیکورٹی، طبی امداد، پنشن، ان کو سرکس کی طرف سے نہیں ملتی۔ جوانی ڈھلنے پر سرکس آرٹسٹ، کرتب دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ تب یہ سب اپنے اپنے گاؤں کو واپس چلی جاتی ہیں۔۔۔۔ آخر آپ یہاں دیکھنے کیا آتے ہیں؟" سیّد صاحب نے دفعتاً غصے کے ساتھ مجھ سے کہا۔ "شام کو انہیں ملاحظہ کیجیے گا۔ یہی بے چاریاں جگمگاتے کپڑوں میں پریوں کی طرح تیرتی اور فضا میں قلابازیاں کھاتی نظر آئیں گی۔ یہ پیٹ بہت مشکل سے پلتا ہے۔ حضور والا۔ اور یہ بھی نہ بھولیے کہ ان فنکاروں کا دنیا کے بہترین سرکس آرٹسٹوں سے مقابلہ سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔"

"ہمارے سرکس دوسرے ملکوں کا بھی تو دورہ کرتے رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

جی ہاں ——— "مگر اس سے ان آرٹسٹوں کی مالی حالت میں کوئی فرق

نہیں پڑتا۔"

میں نے ذرا تعجب سے سید صاحب کو دیکھا۔"آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"میں سیٹھ صاحب کا ڈرائیور ہوں۔ ویسے میں نے ایک زمانے میں مدارس یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ بھی کیا تھا۔"

میں خاموش ہو گیا۔ اور سید صاحب کے ساتھ یوریشین فن کاروں کے کیمپ کی طرف بڑھا۔

اب ہم جس ماحول میں داخل ہوتے تھے۔ وہ صاف ستھرا اور نسبتاً خوش حال نظر آ رہا تھا۔ ایک خیمے کے سامنے ایک یوریشین نوجوان سلیپنگ سوٹ میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ ایک خیمے سے مغربی موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ سامنے سے بطخوں کی ڈار قیں قیں کرتی، پر پھیلاتی گزر گئی۔

خیموں کے رسوں کو پھلانگتے ہوتے سید صاحب نے ایک دروازے پر جا کر آواز دی "بیٹی او لگار،"

"کم اِن!"

ہم جوتے اتار کر اندر گئے۔ خیمہ اندر سے دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ زمین پر دری بچھی تھی۔ ایک تخت پر سلائی کی مشین رکھی تھی۔ ایک پلنگ اور چند کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک ادھیڑ، موٹی اور خوش مزاج خاتون نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔

"یہ بادام تمہارا ہیں،" سید صاحب نے کہا۔

مادام نے شرما کر مجھ سے بیٹھنے کے لئے کہا۔

"لو بھئی تمارا بیگم اپنا قصہ بھی لگے ہاتھوں سنا دو۔ بڑے بڑے انٹرویو ہو رہے ہیں آج" سیّد صاحب نے اردو میں کہا۔

"مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

"اجی اردو میں تقریر کرد۔ ہندی میں آتم کتھا سناؤ۔"

"مس اولگا کو بلا دوں! اولگا ——"

"ہاں ممی —— " ایک پندرہ سالہ لڑکی خیمے کے دوسرے حصّے سے نکل کر آئی۔

"یہ ہماری ونڈر گرل اولگا ہے۔" سیّد صاحب نے شفقت سے کہا۔ مادام کی بچّی"

مجھے مس لارا کی کریدا لگ گئی تھی۔ جو بقول سیّد صاحب شاعرہ اور افسانہ نگار بھی تھیں۔ مگر میں نے فوراً اولگا کے متعلق نوٹ لینے شروع کر دیئے۔

مادام تمارا سفید روسی تھیں۔ انقلاب کے وقت ان کے والدین بھاگ کر ایران چلے آئے تھے اور مادام بہتی بہاتی ہندوستان آ پہنچی تھیں۔ مختلف مرحلوں سے گزرنے کے بعد ایک سرکس کے بازی گر سے انہوں نے شادی کر لی۔ جو چند سال بعد انہیں چھوڑ کر رفو چکر ہو گیا۔ مگر غائب ہونے سے پہلے خوش قسمتی سے وہ اپنی بیٹی اولگا کو اپنے حیرت انگیز کرتب سکھا گیا تھا۔

"اولگا کو کتنی تنخواہ ملتی ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"آپ کو تنخواہ سے مطلب؟" اچانک ایک ویلن نما شخص نے قنات کے

پیچھے سے نمودار ہو کر مجھ سے پوچھا۔ میں گھبرا گیا۔ مگر مادام نے جو خاصی کم عقل معلوم ہوتی تھیں۔ چپکے سے دو انگلیاں اُٹھائیں۔

" دو ہزار ؟ " میں نے پوچھا۔

" دو سو " انہوں نے آہستہ سے بتایا۔

" غضب خدا کا۔ " میں نے دل میں کہا۔ اولگا مجھ سے معذرت چاہ کر مشتق کے لئے باہر چلی گئی۔

" اب میں مس لارا کو بلاتا ہوں۔ " سید صاحب نے اس انداز سے کہا گویا کہہ رہے ہیں " اب میں آپ کو دوسرا تماشہ دکھاتا ہوں۔ " اور غائب ہو گئے۔ ویلن نما شخص بھی مادام تمارا کو گھور کر دیکھتا ہوا اولگا کے پیچھے پیچھے باہر جا چکا تھا۔ مادام مٹی کا مادھو بنی تخت پر بیٹھی رہیں۔ میں نے انہیں سگریٹ پیش کیا۔ دنیا ایسا میدانِ حشر ہے جس میں بڑے بڑے عاقلوں، عالموں، فاضلوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ اس بے چاری بھولی سی عورت نے اس میدانِ حشر میں کیسے کیسے دھکے نہ کھائے ہوں گے۔ اور اب بھی ....

" معاف کیجئے گا میرے پاپا کی طبیعت خراب ہے، ورنہ میں آپ کو اپنے خیمے میں بلا لیتی۔ "

میں نے چونک کر سر اُٹھایا۔ کاسنی فراک میں ملبوس حسین اور باوقار سنہرے بالوں والی مس لارا سامنے کھڑی تھیں۔ جیسے ہی میں کرسی سے اُٹھا۔ وہ میرا چہرہ دیکھ کر اچانک گم صم رہ گئیں اور ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگیں۔

خدا کی قسم انہیں ہالی وڈ میں ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے سوچا۔ مگر وہ مجھے اسی

طرح نکے جا رہی تھیں۔ وہ پھر ذرا لڑکھڑا کر کرسی پہ بیٹھ گئیں۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" میں نے سوالیا نظروں سے سید صاحب کو دیکھا انہوں نے کندھے اچکائے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا کہا کہ یہ ایسی ہی ہیں۔ ان کی جو ادا ہے انوکھی۔

"ہاں ——" مس لارا نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

واضح ہو کہ میں سات بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے بیشتر نوجوان خواتین کو اپنی بہنیں ہی سمجھتا ہوں۔ اور مس لارا میری شاہدہ باجی کی ہم عمر معلوم ہو رہی تھیں۔ لہٰذا یہ ہرگز نہ سمجھئے کہ میں ان پہ عاشق ہو گیا۔

مگر ان کی شخصیت نے مجھے متاثر بے حد کیا۔ اور کوفت یہ ہو رہی تھی کہ وہ سید صاحب مسخرے جیسے کے کھمبے سے لگے۔ میری اس کیفیت سے خاصے محظوظ ہو رہے تھے۔ ہڑبڑا کر میں نے نوٹ بک سنبھالی۔ اور بولا "آپ شاعری بھی کرتی ہیں؟ یہ بات ہمارے قارئین کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہو گی۔"

"ٹاپ روپ ڈانسر جو شاعرہ بھی ہیں —— یہ سرخی جمائیں گے آپ؟" مس لارا نے طنزیہ اور تلخ انداز میں قہقہہ لگایا۔ پھر بولیں "جی ہاں میں لکھتی ہوں کبھی کبھی۔ مگر چھپواتی نہیں۔ آپ —— کس اخبار سے آئے ہیں؟"

میں نے ادب سے اپنا کارڈ پیش کیا۔ کارڈ پر نظر ڈالے بغیر انہوں نے اسے تپائی پہ رکھ دیا اور سر نہوڑا کر اپنی کنپٹیاں دبانے لگیں ——

"میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ سیٹھ جی کو باہر جانا ہے" سید صاحب نے کہا اور چق اٹھا کر باہر نکل گئے۔

خیمے کے دوسرے حِصّے سے سالن جلنے کی بو آئی اور مادام تمارا جواب تک بے وقوفی کے عالم میں مسکرا مسکرا کر ہم سب کی شکلیں دیکھنے میں مصروف تھیں لپک کر دوسری طرف چلی گئیں۔ مس لارا نے پہلو بدلا اور پھر مجھے تکنے لگیں آنکھیں بند کیں آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے کہا۔

"ایک مرتبہ میں نے اپنے ایکٹ کے لئے ایک سیاہ لباس تیار کیا اور اس پہ گلابی ستارے ٹانکنے لگی تو ایسا لگا جیسے زندگی کی اندھیری رات میں دکھوں کے کنول جل رہے ہوں —— پھر —— میں نے ایک بار —— میں نے سبز رنگ کے لباس پہ زرد تتلیاں جڑیں اور سوچتی رہی کہ یہ زرد تتلیاں منجمد اداسی ہیں —— میں کیا بتاؤں —— کس طرح اور کیسے؟ انہوں نے کنپٹی پہ انگلی بجائی۔

مجھے اچانک خیال آیا۔ کہ مس لارا ہر اخبار نویس کو اسی انداز میں یہ کنول اور تتلیاں والا قصہ سُناتی ہوں گی۔ مس لارا بن رہی تھیں —— مگر میرے پاس کیا ثبوت تھا۔ کہ مس لارا بن رہی ہیں۔ اور خلوص اور سادگی سے یہ سب مجھے بتا رہی ہیں۔ اتنے میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور میرے کارڈ پر ان کی نظر پڑی۔ جس پہ میرے اخبار کا نام درج تھا۔ یکایک اس کا رنگ سپید پڑ گیا۔ مجھے ایسا لگا۔ جیسے وہ مرنے والی ہوں ——

"آپ سرکس میں کب سے ہیں؟" میں نے سہم کر دبی زبان سے سوال کیا۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے اس طرح دیکھا۔ جیسے میرے سر پہ سینگ تھے "کیا کہا؟" انہوں نے غصے سے کانپ کر پوچھا۔

میں اس انٹرویو سے پہلے ہی بوکھلا رہا تھا۔ اب بالکل ہی سٹی گم ہو گئی —— جی —— جی —— آپ فرانسیسی ہیں نا؟ اس سرکس میں کب سے —— دیکھئے میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے —— اسٹوری جلد از جلد فائل کرنی ہے۔"

"اسٹوری —— اسٹوری فائل کرو گے میری —— ایں ——۔"

وہ طیش سے لرز رہی تھیں۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

اچانک انہوں نے خود کو سنبھالا اور رومال سے چہرہ پونچھ کر بڑے کرب سے کہا۔ "مجھے معاف کر دو پال —— میں —— میری طبیعت خراب ہے۔ ہاں میں فرانسیسی ہوں۔ پانڈیچری کی رہنے والی ہوں —— سترہ برس سے سرکس میں کام کر رہی ہوں۔"

مجھے پال، پال نہ جانے کیوں کہے جا رہی تھیں۔ خیر میں نے جلدی جلدی لکھنا شروع کیا۔

"میرے باپ پانڈیچری میں جج تھے۔" انہوں نے ایک اوق سا فرنچ نام لیا۔ چنانچہ ظاہر ہے۔ یہ گپ نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے تعجب کا اندازہ لگا کر انہوں نے کہا "جج کی لڑکی ٹاپٹ روپ ڈانسر کیسے ہو گئی؟"

وہ کرسی سے اُٹھ کر ذرا ڈرامائی انداز میں ٹہلنے لگیں اور پھر تیوری پر بل ڈال کر انہوں نے مجھے تکنا شروع کر دیا۔ "تم پال کے ہم زاد معلوم ہوتے ہو۔ اس کے جڑواں بھائی لگتے ہو —— اس کی بھی یہی عمر تھی۔ میرے اکلوتے بھائی کی —— پال کی بھی یہی عمر تھی جب وہ مرا —— خداوندا —— "وہ کرسی پر

بیٹھ گئیں۔ اور ایک دوسری آواز میں کہنا شروع کیا۔ "پانڈیچری کالج میں پال کا ایک پروفیسر تھا ـــــ وہ ـــــ "

"نہیں ـــــ آپ کی نجی کہانی نہیں ـــــ میں تو محض ایک معمولی سا انٹرویو ـــــ " میں نے ہکلا کر کہا۔

"نجی کہانی؟ وہی تو میں تم کو سناؤں گی بٹیا جی۔" انہوں نے غصے سے سرخ ہو کر کہا۔ "خدا کی شان ہے۔ تمہارا اخبار میرے انٹرویو کے لئے رپورٹر بھیجتا ہے ـــــ خدا کی شان ہے۔"

"جی تو آپ کے والد جج تھے۔" میں نے پھر قلم سنبھالا۔

"والد کو مارو گولی ـــــ " مس لارا نے گرج کر کہا۔ "اور کان کھول کر سنو۔ آج دنیا کو معلوم ہو جانا چاہیے۔ کہ کیتھرین دوپال مس لارا کیسے بنی دوسری سرخی یہ لگانا ـــــ " وہ ہسٹریائی انداز میں ہنسنے لگیں۔ پھر دفعتاً بولیں۔ "پال کا پروفیسر جو میرا عاشق صادق تھا ہاہا ـــــ ہندوستانی شہزادہ ـــــ عاشق جاں نثار ـــــ " "وہ مجھ سے کہتا تھا ـــــ "مجھ سے شادی نہیں کرو گی تو مر جاؤں گا۔ ہاہا ہو ہو ہو ـــــ "

مس لارا نے قہقہوں سے بے حال ہوتے ہوتے آنسو پونچھے۔ "مادام تمارا گھبرا کر دواتی ہاتھ میں سنبھالے دروازے میں آئیں مس لارا دھاڑتی رہیں "ہو ہو ہو کہتا تھا وہ میرا پہلا اور آخری عاشق صادق ہے۔ ہم دونوں پیرس جائیں گے۔ وہاں میں مشہور مصنف بنوں گا۔ تم نامور بیلے ڈانسر بننا۔ وہ بڑا انٹیلکچوئیل تھا۔ اسی لئے مجھے چھوڑ کر ـــــ بلا وجہ ـــــ بلا وجہ کلکتہ بھاگ گیا۔ اور وہاں جا کر

ایک بنگالی لڑکی سے شادی کرلی۔ ارے تمارا تمہارا والا تو معمولی مداری تھا۔ یہ کالج پہ وفیسر بھی بھاگ نکلا ـــــ سرپٹ ـــــ ہا ہا ہا ـــــ ہو ہو ہو۔ بھئی کیا زوردار لطیفہ ہے۔" پھر انہوں نے ہنسنا بند کیا اور سیدھی ہوکر بیٹھ گئیں۔ اور بالکل تنبیہی آواز میں انگلیوں پہ گننا شروع کیا ـــــ پال مرا ـــــ پاپا مرے ـــــ غریبی چھائی ـــــ ادبار ـــــ نحوست ـــــ مسلسل افلاس سے تنگ آکر ماما نے سرکس کے ایک "فولادی آدمی" سے شادی کرلی ـــــ ان مصیبت کے دنوں میں صرف وہی سہارا دینے والا ہمیں میسر آیا تھا۔ یہ نہ پوچھو کہ وقت کس طرح بدلتا ہے زمانہ کس طرح بدلتا ہے۔ اور خدا سے ڈرتے رہو۔ وقت کسی گھڑی بھی بدل سکتا ہے مصیبت کسی گھڑی بھی آکر دبوچ سکتی ہے۔

" نئے پاپا نے جو اینگلو انڈین ہیں مجھے سرکس کی ٹریننگ دی۔ سرکس میں بہت کم عمر سے کام سکھایا جاتا ہے۔ مگر میں بیلے جانتی تھی۔ اس لئے توازن قائم کرنا آسانی سے سیکھ گئی۔ دن رات محنت دن رات محنت۔"

" پہلی بار رنگ میں جاکر آپ کو ڈر لگا تھا؟" میں نے مبہوت ہوکر پوچھا۔

" مجھے آج تک ڈر لگتا ہے ـــــ روز شام کو ڈر لگتا ہے ہر شام کو مجھے یقین ہوتا ہے کہ آج پنڈال سے زندہ نہیں نکلوں گی۔ ہم سب کو ڈر لگتا ہے۔ سرکس کے سارے بہادر آرٹسٹوں کو روزانہ موت کا خوف رہتا ہے ـــــ بیٹے ـــــ پال ـــــ بھیا ـــــ زندگی گزارنا ـــــ جوانی سے لے کر قبر تک کا فاصلہ طے کرنا آسان بات نہیں ہے۔"

مادام تمارا دروازے سے واپس چلی گئیں۔

" میں بیک وقت دو دنیاؤں میں زندہ ہوں۔ مجھے معلوم نہیں میں کون ہوں، کیا ہوں۔ ایکٹ شروع ہونے سے پہلے جس کے لئے بینڈ بجتا ہے۔ وہ کون ہے اور جو ہستی تار پر سائیکل چلا رہی ہے وہ کون ہے؟" پھر وہ خاموش ہو گئیں۔ چند لمحوں بعد انہوں نے آزردگی سے کہا" میرا کوئی دوست نہیں۔"

" ویسے سرکس والوں کی سوشل زندگی کیسی ہوتی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

" یوں ہماری بڑی متحد زندگی ہے۔ باہر کی دنیا نہ ہمیں سمجھ سکتی ہے۔ نہ ہم سے واقف ہے۔" انہوں نے ذرا مسکرا کر کہا۔ اب وہ نارمل ہو رہی تھیں۔ طوفان گزر چکا تھا۔" ہمارے سرکس ہی میں تم کو بلجین، سفید روسی، جاپانی، اطالوی اور انگریز خاندان ملیں گے۔ سرکس جن کا آبائی پیشہ ہے۔ ہماری بڑی بین الاقوامی برادری ہے، یہ مسخرے، بازی گر اور مداری میرے رفیق ہیں۔ ان سے الگ ہو کر باہر کی دنیا میں خود کو بڑا غیر محفوظ سا محسوس کرتی ہوں ——— میں اس شہر میں نہیں آنا چاہتی تھی۔"

" کیوں؟"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئیں، مٹھیاں بھینچ کر انہوں نے کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ پاپا کو بخار ہے ورنہ میں تم کو اپنے خیمے میں لے جا کر تمہیں کھانا کھلاتی ——— تمہاری خاطر کرتی ——— تم پال ہو، تھوڑی سی دیر کے لئے تم عالم بالا سے واپس آ گئے تھے۔" انہوں نے دونوں ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیئے۔ اور کہا ——— " اچھا اب بھاگ جاؤ۔ دوبارہ نہ آنا اور یہ بھی یاد رکھو کہ میں اپنی کہانی پال کو سنائے بغیر نہ رہ سکی۔ کیونکہ اس کے مرنے کے بعد مجھ پر مصیبت

ٹوٹی تھی۔ اسے شاید معلوم بھی نہ ہو کہ زندگی نے میرے ساتھ کیا کیا ـــــ تو میں نے اسے سنانا ضروری سمجھا تھا ـــــ مگر یہ کہانی اس اخبار ـــــ اس اخبار کے لیئے نہیں ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں مادموزیل، آپ اس انٹرویو کے متعلق جب اگلے اتوار کو اخبار میں پڑھیں گی، تو آپ کو کوئی شکایت نہ ہو گی۔" شکایت ـــ! ہاہاہا ـــــ!"

وہ مجھے پہنچانے کے لیئے باہر پھاٹک تک آئیں۔ راستے میں سرکس کی چند اینگلو انڈین لڑکیاں ملیں جو وضع قطع سے نہ جانے کیوں، اگلے وقتوں کی مس ادھوری اور مس روز معلوم ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ذرا ادب سے مس لارا کو، گڈ مارننگ کیا۔ پھر تین مرد آرٹسٹ ملے جو ہندوستانی تھے انہوں نے بڑے خلوص سے مس لارا سے دو چار باتیں کیں ـــــ واقعی، عجیب پر اسرار دنیا تھی۔

شام کو میں سرکس دیکھنے گیا۔ رادھا اور کملا اور پدیا واقعی پریوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر مصنوعی لیکن با ہمت مسکراہٹیں تھیں۔ پھر دھماکے کے ساتھ بینڈ بجا اور جگمگ کرتی مس لارا رنگ میں آئیں۔ ایک بے حد موٹے اینگلو انڈین نے، جو میں سمجھ گیا کہ ان کا سوتیلا باپ اور سابق "فولادی انسان تھا۔ اپنی نگرانی میں ان کی سیڑھیاں وغیرہ نصب کرائیں بے حد بلندی پر پہنچ کر مس لارا نے اکتائی ہوئی اور حقارت کی نظروں سے مجمع کو دیکھا۔ گویا للکار کر کہتی ہوں۔ کون ہے۔ جوان تماشائیوں

کا تماشہ دیکھے۔ پھر انھوں نے اپنے انتہائی خطرناک کرتب شروع کئے (مجھے ڈر لگتا ہے ——— روز شام کو ڈر لگتا ہے") تار پر طرح طرح سے سائیکل چلائی۔ فضا میں قلابازیاں کھائیں۔ تماشائی سانس روکے رہے۔ اور بوڑھا سوتیلا باپ نیچے جال کے کنارے کھڑا ماتھے سے پسینہ پونچھتا رہا۔

پھر مس لارا نیچے اتریں، اسی بے زاری کے ساتھ مجمع کو دیکھا اور رنگ سے واپس جانے سے پہلے سامنے کی کرسیوں پر غور سے نظر ڈالی۔ جیسے کسی کو تلاش کرتی ہوں۔ پھر مایوس ہو کر مجمع کی سمت ہاتھ ہراتی باہر چلی گئیں۔

جب میں پھاٹک سے باہر آرہا تھا۔ تو دیکھا کہ مس لارا کواڑ کے پیچھے میری منتظر ہیں ان کو یہ امید کیسے تھی۔ کہ میں اس جم غفیر میں انھیں مل جاؤں گا؟ جب میں قریب پہنچا تو میرا ہاتھ پکڑ کر انھوں نے آہستہ سے کہا "پال ——— اپنے محترم بوس سے کہنا کہ سرکس کی ایک گم نام، بے عزت، بے تکی ٹائیپ روپ ڈانسر نے انھیں معاف کر دیا۔"

اتوار کی رات کو ایڈیٹر صاحب کماری سروجنی گپتا کے ساتھ نیویارک جا چکے تھے۔ پیر کی صبح کو میں اپنے دفتر میں اپنے ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کہ سنڈے ایڈیشن کے لئے ایک کالم کی اسٹوری کہاں سے لاؤں ؟"

فصلِ گُل آئی یا اجل آئی

صبح میں گلی کے دروازے میں کھڑی سبزی والے سے گوبھی کی قیمت پر جھگڑ رہی تھی۔ اوپر باورچی خانے میں دال چاول ابالنے کے لئے چڑھا دیئے تھے۔ ملازم سودا لینے کے لئے بازار جا چکا تھا۔ غسل خانے میں وقار صاحب چلتی کی چلچی پر لگے ہوئے مدھم آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہوئے گنگنا رہے تھے۔ اور شیو کرتے جاتے تھے۔ میں سبزی والے سے بحث کرنے کے ساتھ ساتھ سوچنے میں مصروف تھی کہ رات کے کھانے کے لئے کیا کیا تیار کیا جائے۔ اتنے میں ایک کار سامنے آکر رکی۔ ایک لڑکی نے کھڑکی میں سے جھانکا اور پھر دروازہ کھول کر باہر اتر آئی میں پیسے گن رہی تھی۔ اس لئے میں نے اُسے نہ دیکھا وہ ایک قدم آگے بڑھی اب میں نے سر اٹھا کر اس پر نظر ڈالی۔

"ارے ـــــ تم ـــــ!" اس نے ہکا بکا ہو کر کہا اور میں وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ایسا لگا جیسے وہ مدتوں سے مجھے مردہ تصور کر چکی ہے اور اب میرا بھوت اس کے سامنے کھڑا ہے۔

اس کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لئے جو دہشت میں نے دیکھی اس کی یاد نے مجھے باؤلا کر دیا۔ میں تو سوچ سوچ کے دیوانی ہو جاؤں گی۔

یہ لڑکی (اس کا نام ذہن میں محفوظ نہیں اور اس وقت میں نے جھینپ کے مارے اس سے پوچھا بھی نہیں ورنہ وہ کتنا بڑا مانتی) میرے ساتھ دلی کے کوئین میری میں پڑھتی تھی۔ یہ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت کوئی سترہ سال کی رہی ہوں گی۔ مگر میری صحت اتنی اچھی تھی کہ اپنی عمر سے کہیں بڑی معلوم ہوتی تھی اور میری خوبصورتی کی دھوم مچنی شروع ہو چکی تھی۔

دلی میں قاعدہ تھا۔

کہ لڑکے والیاں اسکول اسکول گھوم کر لڑکیاں پسند کرتی پھرتی تھیں اور جو لڑکی پسند آتی تھی۔ اس کے گھر رقعہ بھجوا دیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں معلوم ہوا کہ اس لڑکی کی ماں، خالہ وغیرہ نے مجھے پسند کر لیا ہے (اسکول ڈے کے جلسے کے روز دیکھ کر) اور اب وہ مجھے بہو بنانے پر تلی ہیں۔ یہ لوگ نور جہاں روڈ پر رہتے تھے اور لڑکا حال ہی میں ریزرو بنک آف انڈیا میں دو ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا نوکر ہوا تھا۔ "رقعہ"، چنانچہ میرے گھر پہنچایا گیا۔ مگر میری اماں جان میرے لئے بڑے اونچے خواب دیکھ رہی تھیں۔ میرے والدین دلی سے باہر میرٹھ میں رہتے تھے اور ابھی میرے بیاہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ پیغام فی الفور نامنظور کر دیا گیا۔

اس کے بعد اس لڑکی نے کچھ عرصہ میرے ساتھ کالج میں بھی پڑھا۔ پھر اس کے بعد شادی ہو گئی۔ وہ کالج چھوڑ کر چلی گئی۔ آج اتنے عرصے بعد لاہور کی

مال روڈ کے پچھواڑے اس گلی میں میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ میں نے اس سے کہا۔ اُوپر آؤ۔ چائے وائے پیو۔ پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ لیکن اس نے کہا میں جلدی میں کسی سسرالی رشتے دار کا مکان تلاش کرتی ہوئی اس گلی میں آ نکلی تھی۔ انشا اللہ پھر کبھی ضرور آؤں گی۔ اس کے بعد وہیں کھڑے کھڑے اس نے نام بنام ساری پرانی دوستوں کے قصے سنائے۔ کون کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔ سلیمہ فلاں بریگیڈیر کی بیوی ہے۔ چار بچے ہیں۔ فرخندہ کا میاں فارن سروس میں ہے۔ اس کی بڑی لڑکی لندن میں پڑھ رہی ہے۔ ریحانہ فلاں کالج میں پرنسپل ہے۔ سعیدہ امریکہ سے ڈھیروں ڈگریاں لے آئی ہے اور کراچی میں کسی اونچی ملازمت پر براجمان ہے۔ کالج کی ہندو ساتھیوں کے حالات سے بھی وہ باخبر تھی۔ پربھا کا میاں انڈین نیوی میں کموڈور ہے۔ وہ بمبئی میں رہتی ہے۔ سرلا آل انڈیا ریڈیو میں اسٹیشن ڈائریکٹر ہے اور جنوبی ہند میں کہیں تعینات ہے۔ لوتیکا بڑی مشہور آرٹسٹ بن چکی ہے اور نئی دلی میں اس کا اسٹوڈیو ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ سب باتیں کر رہی تھی۔ مگر ان کی آنکھوں کی اس دہشت کو میں نہ بھول سکی۔

اس نے کہا:

"میں سعیدہ ریحانہ وغیرہ جب بھی کراچی میں اکٹھے ہوتے ہیں تمہیں برابر یاد کرتے ہیں۔"

"واقعی؟" میں نے کھوکھلی ہنسی ہنس کر پوچھا۔ مجھے معلوم تھا۔ مجھے کن الفاظ میں یاد کیا جاتا ہوگا: چھپل پاتیاں، ارے کیا یہ لوگ میری سہیلیاں تھیں؟

عورتیں دراصل ایک دوسرے کے حق میں چڑیلیں ہوتی ہیں، کٹنیاں، افاعیں اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ میں یہاں نیم تاریک سنسان گلی میں اس کھنڈر ایسے مکان کے شکستہ زینے میں کیا کر رہی ہوں۔ اسے معلوم تھا۔

عورتوں کی انٹیلیجنس سروس اتنی زبردست ہوتی ہے کہ انٹر پول بھی اس کے آگے پانی بھرے اور پھر میرا قصّہ تو الم نشرح ہے۔ میری حیثیت کوئی قابلِ ذکر نہیں، گمنام ہستی ہوں۔ اس لئے کسی کو میری پرواہ نہیں۔ خود مجھے بھی اپنی پرواہ نہیں۔

میں تنویر فاطمہ ہوں۔ میرے ابا میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ معمولی حیثیت کے زمیندار تھے۔ ہمارے یہاں بڑا سخت پردہ کیا جاتا تھا۔ خود میرے چچا زاد پھوپھی زاد بھائیوں سے پردہ تھا۔ میں بے انتہا لاڈوں کی پلی چہیتی لڑکی تھی۔ جب میں نے اسکول میں بہت سے وظیفے حاصل کر لئے تو میٹرک کرنے کے لئے خاص طور پر میرا داخلہ کوئین میری اسکول میں کرا یا گیا۔ انٹر کے لئے علی گڑھ بھیج دی گئی۔ علی گڑھ گرلز کالج کا زمانہ میری زندگی کا بہترین دور تھا۔ کیسا خواب آگیں دور تھا۔ میں جذبات پرست نہیں لیکن اب بھی کالج کا صحن، روشیں، گھاس کے اونچے پودے، درختوں پر جھلی بارش، نمائش کے میدان میں گھومتے ہوئے کالے برقعوں کے پردے، ہوسٹل کے پتلے پتلے برآمدوں، چھوٹے چھوٹے کمروں کی وہ شدید گھریلو فضائیں یاد آتی ہیں تو جی ڈوب سا جاتا ہے۔ ایم ایس سی کے لئے میں پھر دلی آگئی۔ یہاں کالج میں میرے ساتھ بھی سب لڑکیاں پڑھتی تھیں۔ ریحانہ۔ سعیدہ، پربھا، فلانی ڈھمکانی مجھے لڑکیاں کبھی پسند نہ آئیں۔

مجھے دنیا میں زیادہ تر لوگ پسند نہیں آئے۔ بیشتر لوگ محض تضیع اوقات ہیں۔ میں بہت مغرور تھی۔ حسن ایسی چیز ہے کہ انسان کا دماغ خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ پھر میں تو بقول شخصے لاکھوں میں ایک تھی۔ شیشے کا سا ایسا جھلکتا ہوا رنگ، سرخی مائل سنہرے بال۔ بے حد شاندار ڈیل ڈول بنارسی ساڑھی پہن لوں تو بالکل کہیں کی مہارانی معلوم ہوتی تھی۔

یہ جنگ کا زمانہ تھا۔ یا شاید جنگ اسی سال ختم ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ بہر حال دلی پہ بہار آئی ہوئی تھی۔ کروڑپتی کاروباریوں اور حکومت ہند کے اعلیٰ افسروں کی لڑکیاں ــــ ہندو ــ سکھ ــ مسلمان لمبی لمبی موٹروں میں اڑی اڑی پھرتیں نت نئی پارٹیاں، جلسے، گانے آج اندرپرستھ کالج میں ڈرامہ ہے۔ کل میرانڈا ہاؤس میں پرسوں لیڈی اردن کالج میں کونسرٹ ہے۔ لیڈی ہارڈنگ اور سینٹ اسٹیفنز کالج، جیمسفورڈ کلب روشن آرا۔ امپریل جیمخانہ۔ غرض کہ ہر طرف الف لیلیٰ کے باب بکھرے پڑے تھے۔ ہر جگہ نوجوان فوجی افسروں اور سول سروس کے بن بیاہے عہدہ داروں کے پیسے ڈالتے نظر آتے ایک ہنگامہ تھا۔

پربھا اور سرلا کے ہمراہ ایک روز میں دلجیت کوز کے یہاں جو ایک کروڑپتی سکھ کنٹریکٹر کی لڑکی تھی کنگ ایڈورڈ روڈ کی ایک شاندار کوٹھی میں گارڈن پارٹی کے لئے مدعو تھی۔

یہاں میری ملاقات میجر خوشونت سنگھ سے ہوئی۔ یہ جھانسی کی طرف کا چوہان راجپوت تھا۔ لمبا تڑنگا کالا بھجنگ لانبی لانبی اوپر کو مڑی ہوئی نوکیلی مونچھیں۔ بے حد چمکیلے دانت ہنستا تو بہت اچھا لگتا۔ غالب کا پرستار تھا۔

بات بات پر شعر پڑھتا قہقہے لگاتا اور جھک جھک کے بے حد اخلاق سے سب سے باتیں کرتا۔ اس نے ہم کو دوسرے روز سینما چلنے کی دعوت دی۔ سرلا پربھا وغیرہ ایک بد دماغ لڑکیاں تھیں اور خاصی قدامت پسند وہ لڑکوں کے ساتھ باہر گھومنے بالکل نہیں جاتی تھیں۔ خوشوقت سنگھ دلجیت کے بھائی کا دوست تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ کہ اتنے میں سرلا نے چپکے سے کہا: "خوشوقت کے ساتھ ہرگز سینما مت جانا سخت لوفر لڑکا ہے۔" میں چپ ہو گئی۔

اس زمانے میں نئی دلی کی دو آوارہ لڑکیوں کے قصے بہت مشہور ہو رہے تھے اور میں سوچ سوچ کر ڈرا کرتی تھی۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھونک کر کس طرح لوگوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی ہیں۔ ہوسٹل میں ہم اکثر اس قسم کی لڑکیوں کے لئے قیاس آرائی کیا کرتے۔ یہ بڑی عجیب اور پر اسرار ہستیاں معلوم ہوتیں۔ حالانکہ دیکھنے میں وہ بھی ہماری طرح ہی کی لڑکیاں تھیں۔ ساڑھیوں اور شلواروں میں ملبوس۔ طرحدار خوبصورت پڑھی لکھی۔

"لوگ بدنام کر دیتے ہیں جی ——" سعدیہ دماغ پر بہت زور ڈال کر کہتی۔

"اب ایسا بھی کیا ہے!"

"در اصل ہماری سوسائٹی اس قابل ہی نہیں ہوئی کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ہضم کر سکے۔" سرلا کہتی

"ہوتا یہ ہے کہ لڑکیاں احساسِ توازن کھو بیٹھتی ہیں۔" ریحانہ رائے دیتی۔

بہر حال کسی طرح یقین نہ آتا کہ یہ ہماری جیسی ہمارے ساتھ کی چند لڑکیاں ایسی ایسی خوفناک حرکتیں کس طرح کرتی ہیں۔

دوسری شام میں لیبارٹری کی طرف جا رہی تھی کہ نکلسن میموریل کے قریب ایک قرمزی رنگ کی لمبی سی کار آہستہ سے رک گئی۔ اس میں سے خوشونت سنگھ نے جھانکا اور اندھیرے میں اس کے خوبصورت دانت جھلملائے۔

"اجی حضرت۔ یوں کہیئے کہ آپ اپنا اپوائنٹمنٹ بھول گئیں"

"جی ——— ؟" میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

"حضور والا۔ چلیئے میرے ساتھ فوراً۔ یہ شام کا وقت لیبارٹری میں گھس کر بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اتنا پڑھ کر کیا کیجیے گا؟"

میں نے بالکل غیر ارادی طور پر چاروں طرف دیکھا اور کار میں دبک کر بیٹھ گئی۔

ہم نے کناٹ پلیس جا کر ایک انگریزی فلم دیکھی۔

اس کے اگلے روز بھی۔

اس کے بعد ایک ہفتے تک میں نے خوب خوب سیریں اس کے ساتھ کیں۔

وہ مینڈ ترین بھرا ہوا تھا۔

اس ہفتے کے آخر تک میں میجر خوشونت سنگھ کی مسٹریس بن چکی تھی۔

میں لٹریری نہیں ہوں، میں نے چینی، جاپانی، روسی۔ انگریزی یا اردو شاعری کا مطالعہ نہیں کیا۔ ادب پڑھنا میرے نزدیک وقت ضائع کرنا ہے۔ پندرہ برس

کی عمر سے سائنس میرا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ میں جانتی تھی کہ مابعد الطبیعاتی تصورات کیا ہوتے ہیں (MYSTIC) کشش کے کیا معنی ہیں۔ شاعری اور فلسفے کے لئے نہ میرے پاس فرصت جب تھی نہ اب ہے۔ میں بڑے بڑے مبہم، غیر واضح اور پر اسرار الفاظ بھی استعمال نہیں کر سکتی۔

بہر حال پندرہ روز کے اندر اندر یہ واقعہ بھی کم وبیش کالج میں سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن مجھ میں اپنے اندر ہمیشہ سے بڑی عجیب سی خود اعتمادی تھی۔ میں نے اب پرواہ نہیں کی۔ پہلے بھی میں لوگوں سے بول چال بہت کم رکھتی تھی۔ سرلاو غیرہ کا گروہ اب مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا گویا میں ریب سے اتر کر آئی ہوں یا میرے سر پر سینگ ہیں۔ ڈائننگ ہال میں میرے باہر جانے کے بعد گھنٹوں میرے قصے دہراتے جاتے۔ اپنی انٹیلیجنس سروس کے ذریعے میرے اور خوشونت کے بارے میں ان کو پل پل کی خبر رہتی۔ ہم لوگ شام کو کہاں گئے۔ رات نئی دلی کے کون سے بال روم میں ناچے (خوشونت معرکے کا ڈانسر تھا۔ اس نے مجھے ناچنا بھی سکھادیا تھا) خوشونت نے مجھے کیا کیا تحائف، کون کون سی دوکانوں سے خرید کے دیئے تھے۔

خوشونت سنگھ مجھے مارتا بہت تھا اور مجھ سے اتنی محبت کرتا تھا۔ جو آج تک دنیا میں کسی مرد نے کسی عورت سے نہ کی ہو گی۔

کئی مہینے گذر گئے۔ میرے ایم ایس سی پریویس کے امتحان سر پر آگئے اور میں پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ امتحانات کے بعد اس نے کہا "جانِ من، دلربا! چلو کسی خاموش سے پہاڑ پر چلیں، سولن، ڈلہوزی، لینسڈاون" میں چند روز کے

لئے میرٹھ گئی اور ابّا سے یہ کہہ کر (امّاں جان کا جب میں تھرڈ ایئر میں تھی تو انتقال ہو گیا تھا) دِلّی واپس آگئی کہ فائنل ایئر کے لئے بے حد پڑھائی کرنی ہے۔ شمالی ہند کے پہاڑی مقامات پر بہت سے شناساؤں کے ملنے کا امکان تھا اس لئے ہم دورِ جنوب میں اوٹی چلے گئے۔ وہاں مہینہ بھر رہے۔ خوشوقت کی چھٹی ختم ہو گئی تو دلی واپس آکر تیمار پور کے ایک بنگلے میں ٹک گئے۔

کالج کھلنے سے ایک ہفتہ قبل خوشوقت کی اور میری بڑی زبردست لڑائی ہوئی۔ اس نے مجھے خوب مارا۔ اتنا مارا کہ میرا سارا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ اور میری باہوں اور میری پنڈلیوں پر نیل پڑ گئے۔ لڑائی کی وجہ اس کی وہ مردار عیسائی منگیتر تھی جو جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی اور سارے دن میرے خلاف زہر اُگلتی پھر رہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو مجھے کچا چبا جاتی۔ یہ چار سو بیس لڑکی جنگ کے زمانے میں فوج میں تھی اور خوشوقت کو برما کے محاذ پر ملی تھی۔ خوشوقت نے جانے کس طرح اس سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا لیکن مجھ سے ملنے کے بعد اب وہ اس کی انگوٹھی واپس کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس رات تیمار پور کے اس سنسان بنگلے میں اس نے میرے آگے ہاتھ جوڑے اور رو رو کر مجھ سے کہا کہ میں اس سے بیاہ کر لوں۔ ورنہ وہ مر جائے گا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ قیامت تک نہیں۔ میں اعلیٰ خاندان سیّد زادی، بھلا اس کالے تمباکو کے پنڈے سے ہندو جاٹ سے بیاہ کر کے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگاتی میں تو اس حسین و جمیل کسی بہت اونچے مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ کے خواب دیکھ رہی تھی جو ایک روز دبدبا جلد بارات لے کر مجھے بیاہنے آئے گا۔ ہمارا آرسی

مصحف ہوگا۔ میں سنہرے جلوے سے رخصت ہو کر اس کے گھر جاؤں گی۔ بجلی بسنت نندیں دروازے پر دہلیز روک کر اپنے بھائی سے نیگ کے لئے جھگڑیں گی۔ میراسینں ڈھولک لئے کھڑی ہوں گی۔ کیا کیا کچھ ہوگا۔ میں نے کیا ہندو مسلم شادیوں کا حشر دیکھا نہیں۔ کتنیوں نے ترقی پسندی یا جذبہ عشق کے جوش میں آکر ہندوؤں سے بیاہ رچاتے اور سال بھر کے اندر جوتیوں میں دال۔ ٹیپی۔ بچوں کا جو حشر خراب ہوا وہ الگ۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔ میرے انکار پہ خوشوقت نے جوتے لات سے مار کر میرا بھرکس نکال دیا اور تیسرے دن اس ڈائن کالی بلا کیتھرائن دھرم داس کے ساتھ آگرے چلا گیا۔ جہاں اس نے اس بدذات لڑکی سے سول میرج کر لی۔

جب میں نئی ٹرم کے آغاز پر ہوسٹل پہنچی تو اس حلیئے سے کہ میرے سر اور چہرے پر پٹی بندھی تھی۔ آپا کو میں نے لکھ بھیجا کہ لیبارٹری میں ایک تجربہ کر رہی تھی۔ کہ خطرناک مادہ بھک سے اڑا اور اس سے میرا منہ تھوڑا سا جل گیا۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ فکر نہ کیجئے۔

لڑکیوں کو تو سارا قصہ پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اخلاقاً میری خیریت بھی نہ پوچھی۔ اتنے بڑے اسکینڈل کے بعد مجھے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت نہ دی جاتی۔ مگر ہوسٹل کی وارڈن خوشوقت سنگھ کی بہت دوست تھی۔ اس لئے سب خاموش رہے اس کے علاوہ کسی کے پاس کسی طرح کا ثبوت بھی نہ تھا۔ کالج کی لڑکیوں کو یوں بھی لوگ بدنام کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے۔ جیسے کل کی بات ہو۔ صبح کے دس گیارہ بجے ہوں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے لڑکیوں کے تانگے آ آکر پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے۔ ہوسٹل کے لان پر برگد کے درخت کے نیچے لڑکیاں اپنا اپنا اسباب اُتروا کر رکھوا رہی تھیں۔ بڑی سخت چل پوں مچا رکھی تھی۔ جس وقت میں اپنے تانگے سے اُتری وہ میرا ڈھاٹے سے بندھا ہوا سفید چہرہ دیکھ کر ایسی حیرت زدہ ہوئیں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں نے سامان چوکیدار کے سر پر رکھوا لیا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ دوپہر کو جب میں کھانے کی میز پر آن کر بیٹھی تو ان قطاموں نے مجھ سے اس اخلاق سے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں جن سے اچھی طرح یہ ظاہر ہو جاتے کہ میرے حادثے کی اصل وجہ جانتی ہیں اور مجھے ندامت سے بچانے کے لئے اس کا تذکرہ ہی نہیں کر رہی ہیں۔ ان میں سے ایک نے جو جنڈال چوکڑی کی گرو اور ان سب کی استاد تھی۔ رات کو کھانے کی میز پر فیصلہ صادر کیا کہ میں نفسیات کی اصطلاح میں (NYMPHO MANIAC) ہوں (مجھے میری جاسوسوں کے ذریعے یہ اطلاع فوراً اوپر پہنچ گئی۔ جہاں میں اس وقت اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس ٹیبل لیمپ لگائے پڑھائی میں مصروف تھی) اور اس کی باتیں تو عام تھیں کہ ایک مچھلی سارے جال کو گندا کرتی ہے۔ اسی لئے تو لڑکیوں کی بے پردگی آزادی خطرناک اور اعلیٰ تعلیم بدنام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں سو فیصدی ان آرام سے متفق تھی۔ میں خود سوچتی تھی کہ بعض اچھی

خاصی بھلی چنگی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں آوارہ کیوں ہو جاتی ہیں۔ ایک تھیوری تھی کہ وہی لڑکیاں آوارہ ہوتی ہیں جن کا "آئی" "کیو" بہت کم ہوتا ہے۔ ذہین انسان کبھی اپنی تباہی کی طرف جان بوجھ کر قدم نہ اُٹھائے گا۔ مگر میں نے تو اچھی خاصی سمجھدار تیز طرار لڑکیوں کو لوفری کرتے دیکھا تھا۔ دوسری تھیوری تھی۔ کہ سیر و تفریح، روپے پیسے، عیش و آسائش کی زندگی، قیمتی تحائف کا لالچ، رومان کی تلاش، ایڈونچر کی خواہش یا محض اکتاہٹ یا بے دے کی قید و بند کے بعد آزادی کی فضا میں داخل ہو کر پرانی اقدار سے بغاوت اس صورت حال کی چند وجوہ ہیں یہ سب باتیں ضرور ہوں گی۔ ورنہ اور کیا وجہ ہوسکتی ہے؟

میں فرسٹ ٹرمنل امتحان سے فارغ ہوئی تھی کہ خوشوقت پھر آن پہنچا۔ اس نے مجھے لیبارٹری میں فون کیا کہ میں نرولا میں چھ بجے اس سے ملوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ کینتھ بن کو اپنے ماں باپ کے ہاں چھوڑ کر سرکاری کام سے دلی آیا تھا۔ اس مرتبہ ہم ہوائی جہاز سے ایک ہفتے کے لئے بمبئی چلے گئے۔

اس کے بعد اس سے ہر دوسرے تیسرے مہینے ملنا ہوتا رہا۔ سال نکل گیا۔ اب کے سے جب وہ دلی آیا تو اس نے اپنے ایک جگری یار دوست کو مجھے لینے کے لئے موٹر دے کر بھیجا کیونکہ وہ لکھنؤ سے لاہور جاتے ہوئے پالم پر چند گھنٹے کے لئے ٹھہر گئے۔ یہ دوست دلی کے ایک بڑے مسلمان تاجر کا لڑکا تھا۔ لڑکا تو خیر نہیں کہنا چاہیئے۔ اس

وقت بھی وہ چالیس کے پیٹے میں رہا ہوگا۔ بیوی بچوں والا۔ تاڑ کا سا قد۔ بے حد غلط انگریزی بولتا تھا۔ کالا بد قطع بالکل چڑچڑ کی شکل۔ ہوش صفت۔

خوش وقت اب کی مرتبہ دلی سے گیا تو پھر کبھی واپس نہ آیا۔ کیونکہ اب میں فاروق کی مسٹریس بن چکی تھی۔

فاروق کے ساتھ اب میں اس کی "منگیتر" کی حیثیت سے باقاعدہ دلی کی اونچی سوسائٹی میں شامل ہوگئی۔ مسلمانوں میں تو چار شادیاں جائز ہیں۔ لہذا یہ کوئی بڑی بات نہ تھی یعنی مذہب کے نقطہ نگاہ سے کہ وہ اپنی ان پڑھ ادھیڑ عمر کی پردے کی بوبو کی موجودگی میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو چار آدمیوں میں ڈھنگ سے اٹھ بیٹھ سکے اور پھر دولت مند طبقے میں سب کچھ جائز ہے یہ تو ہماری مڈل کلاس کے قوانین ہیں، کہ یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ طویل چھٹیوں کے زمانے میں فاروق نے بھی مجھے خوب سیر کرائی۔ کلکتہ، لکھنؤ، اجمیر کون سی جگہ تھی جو میں نے اس کے ساتھ نہ دیکھی۔ اس نے مجھے ہیرے جواہرات کے گہنوں سے لاد دیا۔ ابا کو لکھ بھیجتی تھی کہ یونیورسٹی کے طالب علموں کے ساتھ ٹور پہ جا رہی ہوں۔ یا فلاں جگہ ایک سائنس کانفرنس میں شرکت کے لئے مجھے بلایا گیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے اپنا تعلیمی ریکارڈ اونچا رکھنے کی دھن تھی۔ فائنل امتحان میں۔ میں نے بہت ہی خراب پرچے کئے اور امتحان ختم ہوتے ہی گھر چلی گئی۔

اسی زمانے میں دلی میں گڑبڑ شروع ہوئی اور فسادات کا بھونچال آگیا۔ فاروق نے مجھے میرٹھ خط لکھا کہ تم فوراً پاکستان چلی جاؤ۔ میں تم سے وہیں ملوں گا۔

میرا پہلے ہی یہ ارادہ تھا۔ ابا جان بھی بے حد پریشان تھے اور یہی چاہتے تھے کہ ان حالات میں اب انڈیا میں نہ رہوں۔ جہاں شریف مسلمان کی لڑکیوں کی عزتیں مستقل خطرے میں ہیں۔ پاکستان اپنا اسلامی ملک تھا۔ اس کی بات ہی کیا تھی۔ ابا جائیداد وغیرہ کی وجہ سے فی الحال ترکِ وطن نہ کر سکتے تھے۔ میرے دونوں بھائی بہت چھوٹے چھوٹے تھے اور اماں جان کے انتقال کے بعد ابا نے ان کو میری خالہ کے پاس حیدر آباد دکن بھیج دیا تھا۔ میرا رزلٹ نکل چکا تھا اور میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوئی۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ جب بلوؤں کا زور ذرا کم ہوا تو میں ہوائی جہاز سے لاہور آگئی۔ فاروق میرے ساتھ آیا۔ اس نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ اپنے کاروبار کی ایک شاخ پاکستان میں قائم کر کے لاہور اس کا ہیڈ آفس رکھے گا۔ مجھے اس کا مالک بنائے گا اور وہیں مجھ سے شادی کرے گا۔ وہ دلی سے ہجرت نہیں کر رہا تھا کیونکہ اس کے باپ بڑے احراری خیالات کے آدمی تھے۔ پلان یہ تھا کہ وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے دلی سے لاہور آتا رہے گا۔ لاہور میں افراتفری تھی، حالانکہ ایک سے ایک اعلیٰ کوٹھی الاٹ ہو سکتی تھی۔ مگر فاروق یہاں کسی کو نہ جانتا تھا۔ بہرحال سنت نگر میں ایک چھوٹا سا مکان میرے نام الاٹ کرا کے اس نے مجھے وہاں چھوڑ دیا اور میری مدد کے لئے اپنے دُور کے رشتے دار کنبے کو میرے پاس ٹھہرا دیا جو مہاجر ہو کے لاہور آئے تھے۔ اور مارے مارے پھر رہے تھے۔

میں زندگی کی یک بیک تبدیلی سے اتنی ہکا بکا تھی کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔ کہاں غیر منقسم ہندوستان کی وہ بھرپور، دلچسپ رنگارنگ دنیا کہاں ۴۸ء کے لاہور کا وہ تنگ و تاریک مکان، غریب الوطنی، اللہ اکبر، میں

نے کیسے کیسے دل ہلا دینے والے زمانے دیکھے ہیں۔

میں اتنی خالی الذہن ہو چکی تھی کہ میں نے تلاشِ ملازمت کی بھی کوئی کوشش نہ کی۔ روپے کی طرف سے فکر نہ تھی کیونکہ فاروق میرے نام دس ہزار روپیہ جمع کروا گیا تھا صرف دس ہزار وہ خود کروڑوں کا آدمی تھا۔ مگر اس وقت میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ اب بھی نہیں آتا)

دن گزرتے گئے۔ میں صبح سے شام تک پلنگ پر پڑی فاروق کے رشتے کی خالہ یا جو کچھ بھی وہ بڑی بی تھیں ان سے ان کی ہجرت کے مصائب کی داستان اور ان کی سابقہ امارت کے قصّے سُنا کرتی اور پان پہ پان کھاتی، یا ان کی میٹرک کی طالب علم بیٹی کو الجبرا جیومیٹری سکھایا کرتی۔ ان کا بیٹا فاروق کی برائے نام بزنس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔

فاروق سال میں پانچ چھ چکّر لگا لیتا۔ اب لاہور کی زندگی رفتہ رفتہ نارمل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آمد سے میرے دن کچھ رونق سے کٹتے۔ اس کی خالہ بڑے اہتمام سے دلّی کے کھانے اس کے لئے تیار کرتیں۔ میں مال کے ہیئر ڈریسر کے یہاں جا کر اپنے بال سیٹ کرواتی۔ شام کو ہم دونوں جم خانہ کلب چلے جاتے اور وہاں ایک کونے کی میز پہ بیئر کا گلاس سامنے رکھے فاروق مجھے دلّی کے واقعات سناتا۔ وہ بے تکان بولے چلا جاتا یا پھر دفعتاً چُپ ہو کر کمرے میں آنے والی اجنبی صورتوں کو دیکھتا رہتا۔ اس نے شادی کا کبھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ میں نے بھی اس سے نہیں کہا۔ میں اب اُکتا چکی تھی۔ کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب وہ دلّی واپس چلا جاتا تو میں ہر پندرھویں دن اپنی خیریت کا

خط اور اس کے کاروبار کا حال لکھ بھیجتی اور لکھ دیتی کہ اب کی دفعہ آئے تو کناٹ پیلس یا چاندنی چوک کی فلاں دوکان سے فلاں فلاں قسم کی ساڑھیاں لیتے آئیے کیونکہ پاکستان میں اچھی ساڑھیاں ناپید ہیں۔ ایک روز میرٹھ سے چچا میاں کا خط آیا کہ ابّا کا انتقال ہوگیا۔

ع جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا

میں جذبات سے واقف نہیں ہوں مگر باپ مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی موت کا مجھے سخت صدمہ ہوا۔ فاروق نے مجھے بڑے پیار کے دلاسے بھرے خط لکھے تو ذرا ڈھارس بندھی۔ اس نے لکھا نماز پڑھا کرو۔ بہت برا وقت ہے دنیا پر کالی آندھی چل رہی ہے۔ سورج ڈیڑھ بلم پر آیا چاہتا ہے۔ پل کا بھروسہ نہیں۔ سارے کاروباریوں کی طرح وہ بھی بڑا سخت مذہبی اور توہم پرست آدمی تھا۔ پابندی سے اجمیر شریف جاتا۔ نجومیوں، رمالوں، پنڈتوں، سیانوں پیروں، فقیروں۔ اچھے اور برے شگونوں، خوابوں کی تعبیر، غرض کہ ہر چیز کا قائل تھا۔ ایک مہینہ میں نے نماز بھی پڑھی۔ مگر جب میں سجدے میں جاتی تو دل چاہتا خوب زور زور سے ہنسوں۔

ملک میں سائنس کی خواتین لیکچراروں کی بڑی زبردست مانگ تھی۔ جب مجھے ایک مقامی کالج والوں نے بے حد مجبور کیا تو میں نے پڑھانا شروع کر دیا۔ حالانکہ ٹیچری کرنے سے مجھے سخت نفرت ہے۔ کچھ عرصے بعد مجھے پنجاب کے ایک دُور افتادہ ضلع کے ایک گرلز کالج میں بلا لیا گیا۔ کئی سال تک میں نے وہاں کام کیا۔ مجھ سے میری طالب علم لڑکیاں اکثر پوچھتیں۔

"ہائے اللہ مس تنویر۔ آپ اتنی پیاری سی ہیں۔ آپ اپنے کروڑ پتی منگیتر سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟"

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

یہ نیا ملک تھا، نئے لوگ، نیا معاشرہ۔ یہاں کسی کو میرے ماضی کا علم نہ تھا۔ کوئی بھی بھلا مانس مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوسکتا تھا۔ (لیکن بھلے مانس، خوش شکل۔ سیدھے سادھے شریف زادے مجھے پسند ہی نہیں آتے تھے۔ میں کیا کرتی) دلّی کے قصّے دلّی میں رہ گئے اور پھر میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ ایک سے ایک حرافہ لڑکیاں اب ایسی پارسا بنی ہوئی ہیں۔ کہ دیکھا ہی کیجئے۔ خود ایڈتھ ہری رام اور رانی خان کی مثال میرے سامنے موجود ہے۔

اب فاروق بھی کبھی کبھی آتا۔ ہم لوگ اس طرح ملتے گویا بیسیوں برس کے پرانے شادی شدہ میاں بیوی ہیں۔ جن کے پاس سارے نئے موضوع ختم ہوچکے ہیں۔ اب سکون، آرام اور ٹھہراؤ کا وقت ہے۔ فاروق کی بیٹی کی حال ہی میں دلّی میں شادی ہوئی ہے۔ اس کا لڑکا اوکسفرڈ جاچکا ہے۔ بیوی کو مستقل دمہ رہتا ہے۔ فاروق نے اپنے کاروبار کی شاخیں باہر کے کئی ملکوں میں پھیلا دی ہیں۔ نینی تال میں نیا بنگلہ بنوا رہا ہے۔ فاروق اپنے خاندان کے قصّے کاروبار کے معاملات مجھے تفصیل سے سنایا کرتا اور میں اس کے لئے پان بناتی رہتی۔

ایک مرتبہ میں چھٹیوں میں کالج سے لاہور آئی تو فاروق کے ایک پرانے

دوست سید وقار حسین خان سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ بھی اپنے وقت کے اکیلے تھے اور کچھ کچھ کم روز تھے۔ دراز قد موٹے تازے سیاہ فام رنگ، عمر میں پینتالیس کے لگ بھگ اچھے خاصے دیو زاد معلوم ہوتے۔ ان کو میں نے پہلی مرتبہ نئی دہلی میں دیکھا تھا۔ جہاں ان کا ڈانسنگ سکول تھا۔ یہ رام پور کے ایک شریف گھرانے کے اکلوتے فرزند تھے۔

بچپن میں گھر سے بھاگ گئے تھے۔ سرکس، کارنیول اور تھیٹر کمپنیوں کے ساتھ ملکوں ملکوں گھومے۔ سنگاپور، ہانگ کانگ، شنگھائی لندن، جانے کہاں کہاں۔ ان گنت قومیتوں اور نسلوں کی عورتوں سے وقتاً فوقتاً شادیاں رچائیں۔ ان کی موجودہ بیوی اڑیسہ کے ایک مارواڑی مہاجن کی لڑکی تھی۔ جس کو یہ کلکتے سے اڑا لائے تھے۔ بارہ پندرہ سال قبل میں نے اسے دلی میں دیکھا تھا۔

سانولی سلونی سی پست قد لڑکی تھی۔ اس کی شکل پر عجیب طرح کا الم برستا۔ مگر سنا تھا کہ بڑی بپتی درتا عورت تھی۔ میاں کی بدسلوکیوں سے تنگ آکر ادھر ادھر بھاگ جاتی لیکن چند روز کے بعد پھر واپس موجود۔ خان صاحب نے کناٹ سرکس کی ایک بلڈنگ کی تیسری منزل میں انگریزی ناچ سکھانے کا ایک سکول کھول رکھا تھا۔ جس میں وہ اور ان کی بیوی اور دو اینگلو انڈین لڑکیاں گویا سٹاف میں شامل تھیں۔ جنگ کے زمانے میں اس اسکول پر ہُن برستا اتوار کے روز ان کے یہاں صبح کو "جیم سیشن" ہوا کرتے۔ ایک مرتبہ میں بھی خوشوقت کے ساتھ وہاں گئی تھی۔ سنا تھا کہ وقار صاحب کی بیوی ایسی مہاستی۔ انسوّیا کی اوتار ہیں کہ ان کے میاں حکم دیتے ہیں (فلاں فلاں لڑکی سے بہنا یا گانٹھو اور

پھر اسے مجھ سے ملانے کے لئے لے کر آو۔ اور وہ نیک بخت ایسا ہی کرتی۔ ایک بار وہ ہمارے ہوسٹل بھی آئی اور چند لڑکیوں کے سر ہوئی کہ اس کے ساتھ بارہ کھمبا روڈ چل کر چائے پئیں۔

تقسیم کے بعد وقار صاحب بقول شخصے لُٹ لٹا کر لاہور آن پہنچے تھے اور مال روڈ کے پچھواڑے ایک فلیٹ الاٹ کروا کے اس میں اپنا سکول کھول لیا تھا۔ شروع شروع میں کاروبار مندا رہا دلوں پر مُردنی چھائی تھی۔ ناچنے گانے کا کسے ہوش تھا۔ اس فلیٹ میں تقسیم سے پہلے آریہ سماجی ہندوؤں کا میوزک اسکول تھا۔ لکڑی کے فرش کا ہال پہلو میں دو چھوٹے کمرے، غسل خانہ اور باورچی خانہ، سامنے لکڑی کی بالکنی اور شکستہ ملتا ہوا زینہ، "ہندو ماتا سنگیت مہاودیالہ" کا بورڈ بالکنی کے جنگلے پر اب تک ٹیڑھا ٹنگا ہوا تھا۔ اسے اتار کر، وقارز اسکول آف بال روم اینڈ ٹیپ ڈانسنگ" کا بورڈ لگا دیا گیا۔ امریکی فلمی رسالوں سے تراش کر جین، کیلی، فریڈ اسٹر، فرینک سناٹرا۔ ڈورس ڈے وغیرہ کی رنگین تصویریں ہال کی بوسیدہ دیواروں پر آویزاں کر دی گئیں اور اسکول چالو ہو گیا ریکارڈوں کا تھوڑا سا ذخیرہ خان صاحب دلّی سے ساتھ لیتے آئے تھے۔ گراموفون اور سیکنڈ ہینڈ فرنیچر فاروق سے روپیہ قرض لے کر انہوں نے یہاں خرید لیا۔ کالج کے منچلے لونڈوں اور نئی دولت مند سوسائٹی کی تازہ تازہ فیشن ایبل بیگمات کو خدا سلامت رکھے۔ دو تین سال میں ان کا کام خوب چمک گیا۔

فاروق کی دوستی کی وجہ سے میرا اور ان کا کچھ بھاوج اور جیٹھ کا سا رشتہ ہو گیا تھا۔ وہ اکثر میری خیر خبر لینے آ جاتے ان کی بی بی گھنٹوں میرے ساتھ

پکانے ریندھنے، سینے پروتے، کی باتیں کیا کرتیں۔ بے چاری مجھ سے بالکل جٹھانی والا شفقت کا برتاؤ کرتیں، یہ میاں بیوی لاولد تھے۔ بڑا اداس بے رنگ سبے لکا سا غیر دلچسپ جوڑا تھا۔ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں۔

کالج میں نئی امریکہ پلیٹ نک چڑی پرنسپل سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ اگر وہ ببر تو میں سوا سیر میں خود ابوالحسن تانا شاہ سے کم نہ تھی۔ میں نے استعفیٰ کالج کمیٹی کے سر پر مارا اور پھر سنت نگر لاہور واپس آ گئی۔ میں پڑھاتے پڑھاتے اکتا چکی تھی۔ میں کوئی وظیفہ لے کر پی ایچ ڈی کے لئے باہر جا سکتی تھی مگر اس ارادے کو بھی کل پر ٹالتی رہی۔ کل امریکنوں کے دفتر جاؤں گی۔ جہاں وہ وظیفے بانٹتے ہیں۔ کل برٹش کونسل جاؤں گی۔ کل ایجوکیشن منسٹری میں اسکالرشپ کی درخواست بھیجوں گی۔

مزید وقت گزر گیا کیا کروں گی باہر جا کر۔ کون سے گڑھ جیت لوں گی۔ کون سے کدو میں تیر مار لوں گی۔ مجھے جانے کس چیز کا انتظار تھا۔ مجھے معلوم نہیں۔

اس دوران میں ایک روز وقار بھائی میرے پاس حواس باختہ آتے کہنے لگے "تمہاری بھابی کے دماغ میں پھر سودا اُٹھا۔ وہ ویزا بنوا کر واپس انڈیا چلی گئی اور اب کبھی نہ آئیں گی۔"

"یہ کیسے؟" میں نے ذرا بے پرواہی سے پوچھا اور ان کے لئے چار کا پانی اسٹوو پر رکھ دیا۔

"بات یہ ہوئی کہ میں نے انہیں طلاق دے دی اور ان کی زبان بہت

بڑھ گئی تھی۔ ہر وقت بڑبڑ۔ بڑبڑ۔" پھر انہوں نے سامنے کے کھڑے پلنگ پر بیٹھ کر خالص شوہروں والے انداز میں بیوی کے خلاف شکایات کا ایک دفتر کھول دیا اور خود کو بے قصور اور حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔

میں نے بے پرواہی سے یہ ساری کتھا سنا کی۔ زندگی کی ہر بات اس قدر بے رنگ، غیر اہم، غیر ضروری اور بے معنی تھی۔

کچھ عرصے بعد وہ میرے یہاں آکر پڑ رہے۔

"نوکروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے کبھی اتنا بھی تم سے نہیں ہوتا کہ آکر ذرا بھائی کے گھر کی حالت ہی درست کر جاؤ، نوکروں کے کان اینٹھو۔ میں سکول بھی چلاؤں اور گھر بھی۔" انہوں نے اس انداز سے شکایتاً کہا گویا ان کے گھر کا انتظام کرنا میرا فرض ہے۔

چند روز بعد اپنا سامان باندھ کر وقار صاحب کے کمروں میں منتقل ہو گئی۔ اور ناچ سکھانے کے لئے ان کی اسسٹنٹ بھی بن گئی۔

اس کے مہینے کے بعد پچھلے اتوار کو وقار صاحب نے ایک مولوی بلوا کر اپنے دو چرکٹوں کی گواہی میں مجھ سے نکاح پڑھوا لیا۔

اب میں دن بھر گھر کے کام میں مصروف رہتی ہوں۔ میرا حسن و جمال ماضی کی داستانوں میں شامل ہو چکا ہے۔ مجھے شور و شغب پارٹیوں اور ہنگاموں سے سخت نفرت ہے۔ لیکن گھر میں ہر وقت "چاچا"، اور "کلیپسو" اور "راک اینڈ رول"، کا شور مچتا رہتا ہے۔ بہر حال یہی میرا گھر ہے۔

میرے پاس اس وقت کئی کالجوں میں کیمسٹری پڑھانے کے آفر ہیں۔

بھلا خانہ داری کے دھندوں سے کہیں فرصت ملتی ہے۔ نوکروں کا یہ حال ہے کہ آج رکھو کل غائب۔ میں نے زیادہ کی تمنا کبھی نہیں کی۔ صرف اتنا ہی چاہا کہ ایک اوسط درجے کی کوٹھی ہو۔ سواری کے لئے موٹر تاکہ آرام سے ہر جگہ آجا سکیں ہم چیتھڑوں میں بے عزتی نہ ہو۔ چار ملنے والی آئیں تو بٹھانے کے لئے قرینے کا ٹھکانا ہو اور بس!

اس وقت ہماری دو ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہوار آمدنی ہے۔ جو دو میاں بیوی کے لئے ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ انسان اپنی قسمت پہ مانع ہو جائے تو سارے دکھ آپ سے آپ مٹ جائیں گے۔

شادی کر لینے کے بعد لڑکی کے سر کے اوپر چھت سی پڑ جاتی ہے۔ آج کل کی لڑکیاں نہ جانے کس رو میں بہہ رہی ہیں۔ کس طرح یہ لوگ ہاتھوں سے نکل جاتی ہیں۔ جتنا سوچوں عجیب سا لگتا ہے اور حیرت ہوتی ہے۔

میں نے کبھی کسی سے فلرٹ تک نہیں کیا۔ خوش وقت فاروق اور اس سیاہ فام دیوزاد کے علاوہ جو میرا شوہر ہے۔ میں کسی چوبتے آدمی سے واقف نہیں۔ میں شاید بد معاش تو نہیں تھی۔ نہ معلوم میں کیا تھی اور کیا ہوں۔ ریحانہ۔ سعدیہ۔ پربھا اور یہ لڑکی جس کی آنکھوں میں مجھے دیکھ کر دہشت پیدا ہوئی شاید وہ مجھ سے زیادہ اچھی طرح واقف ہوں۔ اب خوش وقت کو یاد کرنے کا فائدہ؟ وقت گزر چکا جانے اب تک وہ بریگیڈیر میجر بن چکا ہو۔ آسام کی سرحد پر چینیوں کے خلاف مورچہ لگائے بیٹھا ہو یا ہندوستان کی کسی ہری بھری چھاؤنی کے میس میں بیٹھا مونچھوں پر تاؤ دے رہا ہو اور سرا رہا ہو۔ شاید وہ کب کا کشمیر کے محاذ

پر جا چکا ہو کیا معلوم؟

اندھیری راتوں میں آنکھیں کھولے چپ چاپ پڑی رہتی ہوں سائنس نے مجھے عالم موجودات کے بہت سے رازوں سے واقف کر دیا ہے۔ میں نے کیمسٹری پر ان گنت کتابیں پڑھی ہیں۔ پلٹر ول سوچا ہے پر مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ اندھیری راتوں میں بہت خوشوقت سنگھ، خوشوقت سنگھ تمہیں اب مجھ سے کیا مطلب؟

آوارہ گرد

پچھلے سال ایک روز شام کے وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں باہر گئی۔ ایک لمبا تڑنگا یوروپین لڑکا کینوس کا تھیلا کندھے پہ اُٹھائے سامنے کھڑا تھا۔ دوسرا بنڈل اس نے ہاتھ میں سنبھال رکھا تھا۔ اور پیروں میں خاک آلود پشاوری چپل تھے۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اپنی دونوں ایڑیاں ذرا سی جوڑ کر سر خم کیا۔ میرا نام پوچھا اور ایک لفافہ تھما دیا۔ "آپ کے ماموں نے یہ خط دیا ہے۔" اُس نے کہا۔

"اندر آ جاؤ!" میں نے اُس سے کہا۔ اور ذرا اچنبھے سے خط پر نظر ڈالی۔ یہ اچھن ماموں کا خط تھا اور انہوں نے لکھا تھا۔

"ہم لوگ کراچی سے حیدرآباد سندھ واپس جا رہے تھے۔ ٹھٹھ کی مکلی ہل پر قبروں کے درمیان اس لڑکے کو بیٹھا دیکھا۔ اس نے انگوٹھا اٹھا کر لفٹ کی فرمائش کی اور ہم اسے گھر لے آئے۔ یہ دنیا کے سفر پہ نکلا اور اب ہندوستان جا رہا ہے۔ اور تو بہت پیارا لڑکا ہے۔ میں نے اسے ہندوستان میں عزیزوں

کے نام خط دے دیئے ہیں اور وہ ان کے پاس ٹھہرے گا۔ تم بھی اس کی میزبانی کرو۔

نوٹ :"اس کے پاس پیسے بالکل نہیں ہیں۔"

لڑکے نے کمرے میں آکر تھیلے فرش پہ رکھ دیئے اور اب آنکھیں چندھیا کر دیواروں پہ لگی ہوئی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ اتنے اونچے قد کے ساتھ اس کا بچوں کا سا چہرہ تھا جس پر ہلکی ہلکی سنہری ڈاڑھی مونچھ بہت عجیب سی لگ رہی تھی۔

ایک اور ہچ ہائیکر ؂ ––– میں نے ذرا کوفت سے پوچھا ––– اچھن ماموں بیچارے فرشتہ صفت آدمی اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئے ہوں گے کیونکہ یہ بین الاقوامی آوارہ گرد اپنی مطلب برآری کے لئے راہ چلتوں سے دوستی کر لینے کا فن خوب جانتے ہیں۔

"شاہدہ نے بھی آپ کو سلام کہا ہے۔" اُس نے میری طرف مُڑ کر بڑی اپنائیت سے کہا۔

"شاہدہ؟"

"آپ کی کزن شاہدہ۔ میں بنارس میں ان کے ہاں مقیم تھا۔ اور لکھنؤ میں آپ کی پھوپھی کے ہاں۔ اور چاٹگام میں انکل احمد کے ہاں رہوں گا اور اگر دارجلنگ جا سکا تو کزن طاہرہ کے گھر پہ ٹھہروں گا۔" اس نے جیب میں سے مزید لفافے نکالے۔

؂ HITCH HIHER

"بیٹھ جاؤ —— اور چائے پیو۔" میں نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ مجھے وہ دو ڈچ ہچ ہائیکرز یاد آئے۔ جنہوں نے کراچی میں حامد چچا کے گھر پڑ ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ کیونکہ اُن کے پاس پیسے ختم ہو گئے تھے۔

"میں ترکی اور ایران ہوتا ہوا آیا ہوں۔ اور جرمنی سے یہاں تک میں نے موٹروں اور لاریوں میں لفٹ لئے ہیں۔ اب لنکا جاؤں گا۔ پھر تھائی لینڈ وغیرہ وہاں سے کارگو بوٹ کے ذریعے جاپان، امریکہ اور اس کے بعد گھر واپس۔ اس وقت تو میں اورنگ آباد سے ایک ٹرک پر آ رہا ہوں۔"

"بے حد ایڈونچرز رہے ہوں گے تمہارے سفر میں؟"

"ہاں استنبول میں میں تین راتیں غلط کے پل کے نیچے سویا۔ اور ایران میں۔" پھر اُس نے مختلف چھوٹے چھوٹے ایڈونچرز سنائے۔ میں کولون یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔" اُس نے مزید اطلاع دی۔

"پاکستان اور ہندوستان میں تم نے کیا فرق پایا۔" کھانے کی میز پر میں نے اُس سے پوچھا۔

"وہاں سب لوگ مجھ سے مسئلہ کشمیر پر بڑے جوش وخروش سے باتیں کرتے تھے۔ یہاں کشمیر اور پاکستان کا ذکر بہت کم کیا جاتا ہے۔ یہاں کے مسائل ——"

پھر اُس نے ہندوستان کے مسائل پہ ایک جامع تقریر کی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "میں دولت سیاحوں اور عام یوروپینوں اور امریکنوں کی مانند محض تاج محل دیکھنے نہیں آیا ہوں۔ میں رات بھر دکانوں کے برآمدوں میں سوتا ہوں کسانوں کی جھونپڑیوں میں رہتا ہوں مزدوروں سے دوستی کرتا ہوں۔ حالانکہ ان کی زبان

نہیں سمجھ سکتا۔"

کھانے کے بعد اس نے بمبئی کا نقشہ نکال کر فرش پہ پھیلایا۔" بے چارے انگریز بمبئی کے طرز تعمیر کو وکٹورین گوتھک کہتے تھے۔ یہاں کیا کیا چیزیں قابلِ دید ہیں ؟"

" ایلفنٹا اور اپالو بندر۔ اور ——"

" یہ سب تو گائڈ بک میں بھی موجود ہے۔" اس نے ذرا بے صبری سے میری بات کاٹی۔ اور ہندوستان کی معاشیات اور عمرانیات پہ نہایت ثقیل اور مدلل گفتگو سے مجھے نوازا۔

" اوٹو —— تمہاری عمر کتنی ہے ؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

" میں اکیس سال کا ہوں۔" اس نے بڑے وقار سے جواب دیا۔" اور جب جرمنی واپس پہنچوں گا تو بائیس سال کا ہو جاؤں گا۔ اور اس کے اگلے سال مجھے ڈاکٹریٹ مل جائے گا۔ میں یونیورسٹی میں جرمن غنائیہ شاعری کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ جرمنی میں صرف ڈاکٹریٹ ملتا ہے۔ جس طرح آپ کے یہاں بی۔ اے ایم۔ اے۔" بعد ازاں وہ دیر تک جرمن غنائیہ شاعری، عالمگیر سیاست اور ہندوستانی آرٹ پہ روشنی ڈالتا رہا۔ وہ تصویریں بھی بناتا تھا۔ کس قدر بقراط لڑکا ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ بیشتر جرمنوں کی طرح انتہائی سنجیدہ اور دُھن کا پکا اور مزاح جس سے تقریباً عاری۔

" میں رات کو سونے سے پہلے آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں۔ ؟"

" یقیناً !"

رات گئے تک نشست کے کمرے میں روشنی جلتی رہی۔ صبح تین بجے غسل خانے میں پانی گرنے کی آواز آئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ وہ راتوں رات نہا دھو کر فارغ ہو چکا تھا۔ تاکہ صبح کو اس کی وجہ سے گھر والوں کو زحمت نہ ہو۔ ناشتے کے وقت اُس نے ہندوستان کے متعلق اس کتاب پر تبادلۂ خیالات کیا جو اُس نے رات بھر میں پڑھ کر ختم کر ڈالی تھی۔ پھر اُس نے بمبئی کا نقشہ اُٹھایا اور سیاحی کے لئے نکل گیا۔

وہ اپنے تھیلے میں پانچ کتابیں لے کر چلا تھا، جن پر کمرہ ٹھیک کرتے وقت میری نظر پڑی۔ گوئٹے کی فاؤسٹ۔ ہائینے کی نظمیں، رلکے۔ بریخت اور انجیل مقدس۔ شام کو جب وہ تھکا ہارا مگر بے حد بشاش واپس آیا تو میں نے اُس سے کہا، "اوٹو! —— کل رات تم خدا سے منکر تھے۔ مگر انجیل ساتھ لے کر گھومتے ہو ——!" اس پر اوٹو نے خدا کے تصور میں ایک جذباتی سہارے کی انسانی حاجت پر مختصر تقریر کی۔

"اوٹو تم ایلفنٹا گئے تھے؟ وہاں کی تری مورتی اور دیوتا ——"

"میں کہیں بھی نہیں گیا۔ وکٹوریہ گارڈن میں دن بھر بیٹھا عوام کے ہجوم کا مطالعہ کرتا رہا۔ انسان —— انسان سب سے بڑا دیوتا ہے۔"

"ہاں ہاں —— یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ مگر تم نے کھانا کہاں کھایا؟"

"میں نے ایک درجن کیلے خرید لئے تھے۔"

مجھے دفعتاً سخت ندامت ہوئی کہ چلتے وقت سینڈوچز اس کے ساتھ کرنے مجھے کیوں نہ یاد رہے۔ اور مجھے اچھن ماموں کے خط کا خیال آیا جس میں

انہوں نے لکھا تھا کہ اس کے پاس پیسے تقریباً بالکل نہیں ہیں۔

کھانے کی میز پر اُس نے کہا ــــ "میں بہت دنوں بعد پیٹ بھر کے کھانا کھا رہا ہوں۔"

میں اُس سے جرمنی کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ برلن کی دیوار کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے مجھے اطلاع دی کہ وہ بہت سخت اینٹی کمیونسٹ ہے۔

"گھر پہ میری اماں بھی میرے لئے بہت مزے دار کھانے پکاتی ہیں۔ آپ میری اماں سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ اب اُن کی عمر بیالیس سال کی ہے۔ مصائب نے اُن کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا ہے۔ مگر وہ اب بھی دنیا کی حسین ترین عورت ہیں۔"

"تم اُن کے اکلوتے لڑکے ہو؟"

"ہاں، میرے ابا فوجی افسر تھے۔ اماں پرشیا کی رہنے والی ہیں۔ اماں سترہ سال کی تھیں، جب انہوں نے ابا سے شادی کی۔ ابا پولینڈ کے محاذ پر مارے گئے۔ ان کے مرنے کے دوسرے مہینے میں پیدا ہوا۔ بمباری سے بچنے کے لئے مجھے کندھے سے لگائے لگائے اماں جانے کہاں کہاں گھومتی رہیں وہ مجھے گود میں اُٹھائے۔ سر پر رومال باندھے فل بوٹ پہنے اپنا مختصر سا سامان میری پرئمبولیٹر میں ٹھونسے گاؤں گاؤں پھرتی تھیں۔ اور کھیتوں کھلیانوں میں چھپتی رہتی تھیں۔ اماں پولینڈ میں ایک گاؤں میں چھپی ہوئی تھیں جب پولش فوجی اس رات اس مکان میں گھس آئے۔ میں اس وقت پورے چار سال کا تھا۔ میرے بچپن کی واضح ترین یاد اس قہرناک رات کی ہے۔ میں ڈر کر پلنگ کے نیچے گھس گیا جب

افسروں نے میری اماں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو میں زور زور سے رونے لگا۔ وہ اماں کو گھسیٹ کر باہر کھیتوں میں لے گئے۔ اماں کئی دن بعد واپس آئیں۔ وہ فوجیوں سے بچنے کے لئے اتنے عرصے تک ایک کھلیان میں چھپی رہی تھیں۔ اور میں اس خالی مکان میں اکیلا تھا۔ اور باہر گولیاں چلنے کی آواز پر سہم سہم کر کونوں کھدروں میں چھپتا پھرتا تھا۔ اور نعمت خانے اور باورچی خانے کی الماریاں کھول کھول کر کھانے کی چیزیں تلاش کرتا تھا اور جو کچھ پڑا مل جاتا تھا بھوک کے مارے منہ میں رکھ لیتا تھا۔ مگر وہ الماریاں سب اونچی اونچی تھیں جن میں کھانے پینے کا سامان تھا۔" وہ چپ ہو گیا اور خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ "یہ چاول بہت مزے کے ہیں۔" اُس نے چند منٹ بعد آہستہ سے کہا

اسی وجہ سے میں جنگ کا تکلیف دہ ذکر نہ چھیڑنا چاہتی تھی۔ میں جنگ کے بعد بڑی ہونے والی نسل سے اس طرح کے اَن گنت لرزہ خیز واقعات سن چکی تھی۔ مجھے وہ فرانسیسی لڑکی یاد آئی جس نے زوال فرانس کے بعد اسی اوٹو کے ہم قوم جرمنوں کی درندگی کے قصے سنائے تھے۔ اسی پولینڈ میں جہاں اوٹو اور اُس کی ماں پر یہ سب بیتی اُسی زمانے میں وہ نازی گیس چیمبر بھی دن رات کام کر رہے تھے۔ جہاں روزانہ ہزاروں یہودیوں کو بھیانک ترین طریقوں سے موت کے بھینٹ چڑھایا جاتا تھا اور جسے برطانوی بمباری نے اندھا کر دیا تھا ـــــ مجھے اس روسی لڑکی کا قصہ یاد آیا جو مجھے کسی نے سنایا تھا۔ اپنے سارے خاندان کو اپنے سامنے جرمن مشین گن کی نذر ہوتے دیکھ کر پل کی پل میں صدمے کی شدت سے اس روسی لڑکی کے بال سفید ہو گئے تھے۔

یہ ۱۹۴۵ء کے بعد یورپ کی نوجوان نسل تھی۔ دنیا کو "تہذیب" سکھانے والے "انسانیت پرست" مسیحی مغربی یورپ نے اپنے بچوں کو ترکے میں کیا دیا تھا۔

"اب تمہاری ماں کچھ کام کرتی ہیں۔؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ محض ایک "ہاؤس فراؤ" ہیں۔ اُن کو فوجی بیوہ کی حیثیت سے پنشن ملتی ہے۔ ہمارا چھوٹا سا دو کمروں کا مکان ہے۔ میں شام کی شفٹ میں ایک فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ میری اماں بہت بھولی بھالی ہیں۔ اسٹرولوجی میں یقین رکھتی ہیں۔ اور پابندی سے گرجا جاتی ہیں پچھلے سال میں نے سائیکل پر سارے جرمنی کا چکر لگایا تھا۔ جرمنی دنیا کا حسین ترین ملک ہے۔"

"ہر ملک اُس کے باشندوں کے لئے دنیا کا حسین ترین ملک ہونا چاہیئے۔ مگر تم "نیئے ناتسی" نہ بن جانا۔"

"نہیں، میں "نیا ناتسی" نہیں بنوں گا۔ مجھے یہودیوں سے بہت زیادہ نفرت نہیں ہے۔" اُس نے سادگی سے کہا۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"میرے نانا، نانی اب بھی مشرقی جرمنی میں ہیں مگر ہم اُن سے نہیں مل سکتے —— جس طرح آپ کا آدھا خاندان یہاں ہے اور آدھا پاکستان میں" اس نے کانٹا اٹھا کر مجھے سمجھایا۔

دوسرے روز اُس سے وعدہ کیا کہ شہر کی قابلِ دید جگہیں ضرور دیکھ کر آئے گا۔ مگر وہ اُس روز بھی دن بھر رانی باغ میں بیٹھا رہا۔

چوتھا دن اُس نے وارڈن روڈ پر بھولا بھائی ڈیسائی انسٹی ٹیوٹ کے برآمدے

میں بیٹھ کر لاؤس کی جنگ کے متعلق مضامین پڑھنے میں گزارا" اندر لڑکیاں رقص سیکھ رہی تھیں اور ہال میں حسین کی نئی تصاویر کی نمائش ہو رہی تھی۔ لہٰذا میں ساتھ ساتھ آرٹ اور کلچر سے بھی بہرہ ور ہوتا رہا۔" اُس نے واپس آ کر کہا۔

بمبئی میں وہ سارے فاصلے پیدل طے کرتا تھا۔ اور وارڈن روڈ سے فلورا فاؤنٹن تک پیدل جاتا تھا اور مجھے یقین ہو گیا کہ جرمن لوگ بلا تشبیہ بقراطوں دیوزادوں اور جناتوں کی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

"میں آٹھ آنے سے ایک روپیہ روز تک خرچ کرتا ہوں اور زیادہ تر کیلے کھاتا ہوں۔ ہر جگہ بے حد مہمان نواز لوگ مل جاتے ہیں کیا یہ عجیب بات نہیں کہ انسان انفرادی طور پر اس قدر سیدھا سادا اور نیک ہے اور اجتماعی حیثیت میں درندہ بن جاتا ہے؟" یہ سوال کرنے کے بعد وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس دن وہ ایک ٹرک کمپنی سے طے کر آیا تھا۔ بنگلور تک اُن کے ٹرک پر جاتے گا۔ صبح سویرے اُس نے اپنے تھیلے میں کتابیں اور کپڑے ٹھونسے۔ دوسرا تھیلا، جو اس کا سفری خیمہ اور بستر تھا لپیٹ کر کندھے پر رکھا۔ خدا حافظ کہا اور ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر فلورا فاؤنٹن پیدل روانہ ہو گیا۔

اوٹو کو گئے کئی مہینے گزر گئے۔ اچھن ماموں کا خط آیا تو میں نے انہیں شکایتاً لکھا کہ آپ کے بیٹے اوٹو نے یہاں سے جا کر یہ بھی اطلاع نہ دی کہ کم بخت اب کہاں کی خاک چھان رہا ہے۔ میں نے اچھن ماموں کو یہ خط پوسٹ کیا ہی تھا کہ شام کی ڈاک سے اوٹو کا لفافہ آ گیا۔ اُس کے ٹکٹوں پر لاؤس کے

بادشاہ کی تصویر بنی تھی اور خط میں لکھا تھا۔

" وہ جرمن لڑکا جو آپ کے گھر ٹھہرا تھا آپ کو بھولا نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ بہت مہربان تھیں (میری انگریزی کمزور ہے۔ غلطیاں معاف کیجیے گا) آپ میرے ساتھ بڑی بہن کی سی شفقت سے پیش آئیں۔ اور میں محبت پر بہت یقین رکھتا ہوں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ابھی بہت کم عمر ہوں۔ لیکن آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ دنیا میں صرف وہی لوگ خوش رہ سکتے ہیں جو زندگی کو بغیر کسی پس و پیش کے بغیر سوالات کیے منظور کر لیں۔ ہم جتنے زیادہ سوالات کرتے ہیں۔ اتنا ہی زیادہ انکشاف ہوتا ہے کہ زندگی کافی مہمل ہے۔

لنکا میں نیورا ایلیا سے کینڈی ایک ٹورسٹ بس کے ذریعے گیا۔ بس میں ایک سنگھالی طالب علم سے میری دوستی ہوگئی۔ اُس نے راستے میں مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ اُس کا نام راجہ تھا۔ اُس نے میرے لیے پھل بھی خریدے۔ بس میں بہت سے ڈھول رکھے تھے۔ راجہ خوب گانے گاتا رہا۔ آبشار بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ راجہ نے مجھ سے کہا، چلو ہم سب نہائیں۔ چند منٹ بعد وہ مر چکا تھا۔ وہ پانی میں ڈوب گیا تھا۔ دو گھنٹے کی تلاش کے بعد اس کی اکڑی ہوئی لاش ہمیں ایک چٹان کے نیچے ملی۔ یہ سب کیا ہے۔ میں سوچتا رہا ہوں کہ یہ کیسے ہوا۔ ہم میں سے کوئی بھی راجہ کو اس حادثے سے بچا نہ سکتا تھا۔ کیا یہ اتفاق تھا یا اسی کو قسمت کہتے ہیں؟ راجہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اس کے بہن بھائی پانچ اور پندرہ برس کی عمروں کے درمیان مر چکے تھے۔ اس کا باپ نابینا ہے اور ماں بہت بیمار۔ راجہ ان لوگوں کا کفیل تھا۔

مدرائے میں ایک نوجوان شاعر نے مجھ سے کہا کہ دنیا کی وجہ سے وہ بہت دکھی ہے۔ مدراس ہی میں میں نے ریڈیو انٹرویو سے کچھ روپے کمائے۔ پھر میں پینانگ گیا، جو بڑا خوبصورت جزیرہ ہے اور وہاں بے شمار چینی رہتے ہیں۔

ایک مال گاڑی کے آخری ڈبے میں بیٹھ کر میں بنگ کاک پہنچا اور بدھ خانقاہوں میں مقیم رہا اور راہبوں کے ساتھ کھانا کھاتا رہا۔ دوپہر کو خوبصورت لڑکیاں اور خوش لباس خواتین اپنی اپنی قسمت اور مستقبل کا حال پوچھنے راہبوں کے پاس آتی تھیں۔

زیادہ تر بھکشو جنت کے بھوکے ہیں۔ اور بے تحاشا تمباکو پیتے ہیں۔ اور کوئی کام نہیں کرتے۔ بوڑھی مذہب پرست خواتین انہیں کھانا اور پیسے دیتی رہتی ہیں۔ بہت سے بھکشو خانقاہوں میں اس لئے بیٹھے ہیں کہ انہیں محنت کرنا اچھا نہیں لگتا۔ یہ لوگ سخت کاہل ہیں۔ مگر ان کے مذہب میں اس کاہلی کا ایک مقدس جواز موجود ہے ــــ نروان کی تلاش ــــ بعض اُن میں سے واقعی سنجیدگی سے مراقبے میں مصروف ہیں۔ لیکن زیادہ تر بھکشو کھانے اور خواتین سے گپ کرنے کے علاوہ سوتے رہتے ہیں۔

نانگ کائی میں میں میکانگ دریا میں نہایا۔ اس کے بعد لاؤس آگیا۔

ڈین تین ایک بڑے سے گاؤں کی مانند ہے۔ دھوپ بہت تیز ہے۔ اور سڑکیں گرد آلود۔ صرف راتیں خوشگوار ہیں۔ کیونکہ اندھیرا ساری بدصورتی، ظلم اور تشدد اور خون ریزی کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ مچھر بہت ہیں۔

سوانا تک ایک ٹیارے میں مجھے مفت کی لفٹ مل گئی۔ اور اب میں پکے میں موجود ہوں۔ پھر کمبوڈیا جاؤں گا۔ میں انکل احمد کے پاس چٹاگانگ نہ جا سکا۔ کیونکہ برما میں داخل ہونے میں بڑی دقتیں تھیں۔ میں نے سرخ چین اور شمالی ویٹ نام کے لئے ویزا کی درخواست دی ہے۔ پیکنگ اور ہنوئی سے مجھے پھوم پنہہ میں جواب مل جائے گا۔ کل میں یہاں سے پھر جنوبی ویٹ نام جا رہا ہوں۔

اس غلط سلط انگریزی کے لئے دوبارہ معافی چاہتا ہوں۔

آپ کا بہت شکر گزار

اولو کر وگر"

فروری ۱۹۶۳ء کے ایک غیر ملکی رسالے میں "ویٹ نام کی جنگل دار" کے عنوان سے ایک رنگین تصویروں والا مضمون چھپا ہے۔ ان تصویروں میں گوریلا سپاہیوں کو بندوقوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ کشتیوں میں بیٹھے ہوئے گوریلا قیدی میکانگ دریا کے پار لے جائے جا رہے ہیں اور کسان عورتیں یہ کشتیاں کھے رہی ہیں۔ کنارے پر پہنچ کر ان قیدیوں کو گولی مار دی جائے گی۔ دھان کے کھیتوں کے پانی میں سے جنگی قیدی گزر رہے ہیں اور مضمون کے آخر میں دو صفحات پر پھیلی ہوئی ایک تصویر ہے جس میں دھان کے ہرے کھیت ہیں۔ اور دھان کی بالیاں ہوا کے جھونکوں سے جھکی جا رہی ہیں اور لمبے پتوں والے درخت ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ افق پر درختوں کی قطاریں ہیں اور سبزہ اور پانی۔ یہ ایسا دلفریب منظر ہے۔ مصور جس کی تصویریں بناتے ہیں۔ شاعر نظمیں لکھتے ہیں اور افسانہ نگار

دھرتی کی عظمت کے متعلق کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان ہرے بھرے درختوں کے پیچھے کسانوں کے پُرامن جھونپڑے ہوں گے اور اس گاؤں کے باسی تنکوں سے بنی ہوئی پھیچے دار نوکیلی ٹوپیاں اوڑھے دن بھر پانی میں کھڑے رہ کر دھان بوتے ہوں گے اور گیت گاتے ہوں گے اور فصل تیار ہونے کے بعد منڈی میں جاکر محنت سے اُگایا ہوا یہ دھان تھوڑے سے پیسوں میں فروخت کر کے اپنی زندگیاں گزارتے ہوں گے۔ اس ندی کے کنارے لڑکیاں اپنے چاہنے والوں سے ملا کرتی ہوں گی۔ اور نوجوان مائیں زنگ بِرنگے سیرونگ پہنے، گھڑے اُٹھائے اپنے بچوں کو نہلانے کے لئے دریا پر آتی ہوں گی۔

لیکن اس تصویر میں جو اس وقت میرے سامنے رکھی ہے۔ کٹے پھٹے چہروں والی نیم عریاں اور خون آلود نوجوان لاشیں پڑی ہیں۔ دُور ایک کونے میں بھورے رنگ کا مہیب جنگی طیارہ کھڑا ہے اور تصویر کے نیچے لکھا ہے۔

"موت کا کھیت ـــــ ویت کونگ گوریلے جن کو میکانگ دریا کے دھان کے ڈیلٹا میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ـــــ ان کے ساتھی ایک دوسرے کے ساتھ رسیوں سے بندھے سر جھکائے ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ اس خونریز دست بدست لڑائی میں ایک نوجوان ہیچ یا ٹیکہ بھی جو میکانگ دریا کے کنارے سے گوریلا شمالی ویٹ نام جا رہا تھا، ایک اتفاقیہ گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس خوبصورت ملک میں یہ بھیانک خانہ جنگی ۱۹۴۴ء سے جاری ہے اور ـــــ"

میں نے تصویر کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ ساحلی گھاس پر اوندھی پڑی ہوئی ایک لاش کا چہرہ اوٹو سے ملتا جلتا تھا۔ اوٹو کر وکمر جو زندگی کا تجربہ حاصل کرنے دنیا کے سفر پر نکلا تھا۔

فہرست مطبوعات

ناقابل فراموش	دیوان سنگھ مفتون	۶۰/-
آگ کا دریا	قرۃ العین حیدر	۴۵/-
فصل گل آئی یا اجل آئی	"	۹/-
آتش گل	جگر مرادآبادی	۲۰/-
تلخیاں	ساحر لدھیانوی	۱۲/-
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	۹/-
پطرس کے خطوط	"	۱۰/-
زیر لب	صفیہ اختر	۱۱/-
حرف آشنا	"	۹/-
کرنیں	شفیق الرحمٰن	۱۲/-
گنجے فرشتے	سعادت حسن منٹو	۱۸/-
ٹھنڈا گوشت	"	۱۲/-
انارکلی	"	۱۰/-
زرد پتے	خلیل جبران	۶/-
پھول کی تنہائی	کرشن چندر	۱۰/-
سمندر دور ہے	"	۱۰/-
برف کے پھول	"	۸/-

مکتبہ اردو ادب

۱۰۹۵ بی ۔ بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ ۔ لاہور